ارشد القادری کا اسلوب

(لالہ زار کے حوالے سے)

مقالہ برائے ایم۔فل

مقالہ نگار

محمد فیروز اختر

نگراں

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی - 110067

2008

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES

SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE & CULTURE STUDIES

NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 29.07 . 2008

DECLARATION

I declare that the work done in this dissertation entitle **"STYLE OF ARSHADUL QADRI WITH SPECIAL REFRERENCE TO LALA-ZAAR"** by me is an original work and has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/Institution.

Md. Firoz Akhtar

MD. FIROZ AKHTAR

(Research Scholar)

DR. K. M. EKRAMUDDIN

(Supervisor)

CIL/SLL&CS/JNU

PROF. CHAMAN LAL

(Chairperson)

CIL/SLL&CS/JNU

Gram: JAYENU, Tel:(91-011) 26741557, 26742676, Extn:4217,(D)26704217,
Fax:(91-011) 26717603, 26717586

فہرست

	صفحہ نمبر
پیش لفظ	1-2
باب اول: ارشد القادری۔ حیات و خدمات	3-47
باب دوم: مذہبی نثر کے اہم اسالیب	48-71
باب سوم: ارشد القادری کا اسلوب (لالہ زار کے حوالے سے)	72-116
باب چہارم: اختتامیہ	117-120
کتابیات:	121-124

انتساب

امی جان (مرحومہ) رئیسہ خاتون کے نام
جن کی دعاؤں کی بدولت میں لوح وقلم کی محبوبی سے آشنا ہوا۔

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

خداوند کریم کی بارگاہ میں ہر وقت یہی دعا ہے کہ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

محمد فیروز اختر

پیش لفظ

مذہبی دنیا میں ارشد القادری ایک عظیم شخصیت کا نام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مذہبی رہنما، مایۂ ناز مفکر اور زبردست مناظر تھے ساتھ ہی وہ سیاسی میدان میں بھی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ خدا نے جہاں انھیں ان تمام صفات سے نوازا وہیں ان کے اندر بھرپور تحریکی و تنظیمی صلاحیت بھی عطا کی۔ ارشد القادری کے تاریخ ساز کارناموں کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جماعتی سطح پر کام کرنے کا جو جذبۂ ایمانی ان کے اندر موجود تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکا۔ انھوں نے اعلیٰ پیمانے پر ترویج و اشاعت کا کام بھی کیا جو یقیناً آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ نہ صرف مشہور و معروف عالم دین تھے بلکہ صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے۔ اس کے باوجود ادبی دنیا میں انھیں وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کے ادبی کارنامے ادبی محاسن سے لبریز ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں ان کے ادبی کارنامے کو نظر انداز کیا گیا اس کے خواہ جو بھی اسباب رہے ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ارشد القادری اردو ادب کے ایک ماہر ادیب تھے۔ ان کی اردو تصانیف جیسے زلزلہ، زیر و زبر اور لالہ زار وغیرہ اس کے بین ثبوت ہیں۔ ان تصانیف کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو مذہبی ادب میں اچھوتا اور منفرد انداز بیان کے خالق ہیں۔ اور جدید اسلوب کے موجد۔ ارشد القادری کا کمال یہ ہے کہ وہ بالکل سادہ جملوں کے ذریعے اپنی فن چابک دستی سے واقعات کو قلم بند کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ انھوں نے مرکب اور ہم آہنگ الفاظ کا حسین امتزاج بھی پیش کیا ہے۔ لفظوں کی تکرار سے بھی کام لیا ہے جس سے جملوں میں آہنگ اور نغمگی پیدا ہو گئی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال بھی بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر ارشد القادری کے ادبی شہ پاروں پر کام کرنے کی ضرورت تھی تا کہ ادبی زاویہ نگاہ سے ان کے کارناموں کا محاکمہ کیا جا سکے۔ لہٰذا میں نے اپنے نگراں اور استاد محترم ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کے مشورے سے اپنے ایم۔فل کے مقالے کا موضوع ''ارشد القادری کا اسلوب (لالہ زار کے حوالے سے)'' طے کیا۔

اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلا باب ''ارشد القادری حیات و خدمات'' کے عنوان سے ہے، جس میں ارشد القادری کا سوانحی خاکہ اور علمی و ادبی

کارنامے پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''مذہبی نثر کے اہم اسالیب'' کے عنوان سے ہے، جس میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سید ابوالحسن ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور امام احمد رضا خاں کے اسالیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب ''ارشد القادری کا اسلوب (لالہ زار کے حوالے سے) کے عنوان کے تحت ہے۔ جس میں لالہ زار کے اسلوب پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا باب ''اختتامیہ'' ہے، جس میں اختصار کے ساتھ مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے مواد کی فراہمی سے لے کر اس کی تکمیل تک جن حضرات کا تعاون شامل رہا ان کا شکریہ ادا کرنا فرض اولین سمجھتا ہوں، سب سے پہلے اپنے مشفق استاد ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کا میں دل کی عمیق گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی کے سبب مقالہ وقت پر مکمل ہو سکا۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں خوشتر نورانی، چیف ایڈیٹر ماہنامہ جام نور، دہلی، جنھوں نے مجھے ارشد القادری سے متعلق تمام کتابیں فراہم کیں اور مفید مشوروں سے نوازا، جس کی وجہ سے مقالہ لکھنے میں کافی آسانی ہوئی اور مقالے کی تکمیل تک ان کا بھرپور تعاون رہا۔

اس مقالے کی تکمیل میں بالواسطہ طور پر ہی سہی مگر جن عزیز و اقارب کا تعاون اور بزرگوں کی دعائیں میرے حوصلے کو ہر لمحہ تقویت بخشتی رہیں ان کا ذکر یہاں میرے لیے نہ صرف باعث افتخار ہے بلکہ عین فریضہ بھی۔ ان بزرگوں میں والد محترم محمد قیام اختر، میرے چاروں بڑے بھائی محمد پرویز اختر، محمد جاوید اختر، محمد شمیم اختر اور محمد خالد اختر۔ دونوں بڑی بہنیں شاہدہ پروین اور نسرین بانو۔ ماموں، چچا، پھوپھا، خالو، خالہ، پھوپھی کی نیک تمناؤں دعاؤں اور ان کی بے لوث محبت کا سراپا ممنون ہوں۔

ایسے وقت میں ان دوستوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہے جنھوں نے مواد کی فراہمی سے اس کی تکمیل تک اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود ساتھ دیا۔ دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں عبدالرافع، سرفراز عالم، تحسین احمد، محمد اکبر، محمد انس، سعید احمد، واثق الخیر کا نام لینا مناسب سمجھتا ہوں۔

اخیر میں اپنی شریک حیات عرشی شمس کا شکریہ ادا کرنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں جن کی محبتیں اور قربانیاں کسی نہ کسی صورت میں ضرور شامل ہیں۔

محمد فیروز اختر
260، جھیلم ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی،
نئی دہلی۔ 110067

جولائی، 2008ء

باب اول

ارشد القادری— حیات و خدمات

ارشد القادری— حیات و خدمات

اس روئے زمین پر ہزاروں بلکہ لاکھوں شخصیتیں جنم لیتی ہیں مگر ان میں کچھ ہی ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جو قابل قدر اور قوم کے لئے سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی ہیں۔ رب قدیر ان کے اندر کچھ اس طرح گوناگوں خوبیاں اور ایسے ایسے اوصاف و کمالات پیدا کر دیتا ہے کہ وہ عام مخلوق سے ممتاز و افضل ہو جاتی ہیں— سلطان المناظرین، فاتح ایشیا و یورپ ارشد القادری انہیں چنندہ عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ یہی وہ ذات با کمال ہے جس میں خدا نے ایسی ایسی خوبیاں جمع کر دیں کہ جن پر آج دنیا کے مسلمانوں کو فخر ہے۔

ارشد القادری کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، انھوں نے مذہب اسلام کی جس اعلیٰ پیمانے پر ترویج و اشاعت کا کام کیا ہے وہ یقیناً آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ وہ صرف ایک عالم دین ہی نہیں بلکہ صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ عظیم مناظر، مذہبی و سیاسی رہنما اور قائد بھی تھے۔ خدا نے جہاں انہیں ان تمام صفات سے نوازا وہیں آپ کے اندر تحریکی و تنظیمی صلاحیت بھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک مایہ ناز مفکر بھی تھے۔ ان کے تاریخ ساز کارناموں کو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جماعتی سطح پر کام کرنے کا جو جذبہ ایمانی ان کے اندر موجود تھا وہ بہت کم شخصیتوں کے حصہ میں آسکا۔

یقیناً دینی و تبلیغی اور افراد کی ذہن سازی جیسے امور کے لئے خدا نے انہیں بلا کا ذہن عطا کیا تھا۔ بقول مولانا مقبول احمد مصباحی:

> ''ارشد القادری صاحب اس وقت بین الاقوامی شہرت کی حامل ایک عظیم علمی، ادبی اور روحانی شخصیت کا نام ہے جن کے تاریخ ساز کارناموں کا سلسلہ نصف صدی طویل عرصے پر محیط ہے۔ وہ قلم کے دھنی ہیں، دل کے غنی، فکر کے کشور کشا، درس و تدریس ان کا آبائی پیشہ ہے، امامت و قیادت اور سیاست و حکومت ان کے ناخن تدبیر کی شرمندہ احساں مناظروں کی کوہ پیمائی کی اور میدان دعوت و تبلیغ کی آبلہ پائی۔ وہ کون سی وادی ہے جس میں انھوں نے قدم نہ رکھا ہو، تنظیم و تحریک کی دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔'' (1)

اگر ان کو ایک عالمی شخصیت کہا جائے تو اپنی جگہ بالکل بجا و درست ہوگا۔ اس لئے کہ ہند و بیرون ہند ہر جگہ ان

کے فضل و کمال کا ڈنکا بج رہا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں ان کی فتح و شہرت کا علم بلند ہو رہا ہے خواہ وایشیا و یورپ کی دھرتی ہو یا امریکہ و افریقہ کی سرزمین۔ غرض کہ ان کا قائم کردہ دینی و اسلامی مشن چہار دانگ عالم میں جاری ہے۔

بقول مفتی عبدالمنان کلیمی:

''ارشد القادری صاحب اس ذات گرامی کا نام ہے جنہوں نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہر میدان علم و فضل میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عقائد و کلام، ردو مناظرہ، مدارس و مساجد، تصنیف و تالیف، خدمت و قیادت اور فکر و سیاست کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں علامہ موصوف کی عظیم الشان، قابل قدر اور لائق فخر یادگار موجود نہ ہو۔ میرے نزدیک علامہ اپنے بہت سارے ہم عصر اور اقران پر ایسے حاوی اور فائق تھے کہ ان سے آگے بڑھنا تو دور کی بات ہے ان کی مثال بھی قائم نہیں کر سکے۔ اگر ہم یہ کہیں تو ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت علامہ عظیم انقلابی شخصیت کے مالک تھے، مثال کے طور پر تصنیف و تالیف میں کتاب زلزلہ، زیر و زبر اور لالہ زار کی اب تک کوئی نظیر سامنے نہیں ہے۔ مساجد و مدارس میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اور جامعہ فیض العلوم اپنی مثال آپ ہے۔'' (2)

مولانا شبنم کمالی اپنے ایک مضمون میں ارشد القادری کے متعلق لکھتے ہیں:

''ارشد القادری کی دلی خواہش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ ہماری جماعت میں خلوص و محبت کے ساتھ کام کرنے والے با صلاحیت لوگوں کا ایک کارواں تیار ہو اور یہ قافلہ میدان عمل میں ہمہ دم قدم بڑھاتا رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میدان تقریر ہو یا میدان تحریر، تعمیر کا معرکہ ہو یا تنظیم کا مرحلہ۔ مسند درس و تدریس ہو یا منزل افتا و قضا۔ سیاست کی سرگرمی ہو یا قیادت کی جفاکشی ہر شعبۂ حیات میں ہمارے جوان علماء ہر جگہ پیش پیش نظر آئیں۔ بعد میں آنے والی نسلیں اپنے پیش رو اسلاف سے با عزت زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھیں۔'' (3)

اسی طرح وہ آگے لکھتے ہیں جس سے ہم ارشد القادری کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکتے ہیں اور ان کی شخصیت کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

''ارشد القادری سے میری ملاقات اور گفتگو کتنی مرتبہ ہوئی اس کا شمار مشکل ہے۔ اگر یہ کہوں کہ سیکڑوں بار ملاقاتیں ہوئیں تو یہ قطعی مبالغہ نہیں ہوگا۔ ادارۂ شرعیہ بہار کے مرکزی دفتر سلطان گنج، پٹنہ کی اکثر میٹنگ، جلسے، کانفرنسوں کے علاوہ ارشد القادری کے پٹنہ کے دورانِ قیام ملاقاتیں ہوئیں۔ فیض العلوم، جمشید پور میں سہ روزہ

قیام۔ میرے مولد و مسکن پوکھریرا، ضلع۔ سیتامڑھی (بہار) کے جلسوں، میری جائے ملازمت جامعہ اسلامیہ امانیہ لوام دربھنگہ کے جلسۂ دستار فراغت میں اور دیگر جلسوں، کانفرنسوں میں مختلف شہروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بعض تبلیغی اور اصلاحی سفروں میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ ان سے ملاقات کا سلسلہ جو 1955ء سے شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ اس لئے میں ان کے جذبات ونظریات، حوصلہ اور عزائم، انداز فکر وعمل غور وخوض کے مراحل ومنازل، ان کے طریقۂ کار سے کسی حد تک واقفیت ضرورت رکھتا ہوں۔ وہ بہ ظاہر تنہا ہو کر بھی لاکھوں افراد پر بھاری ہیں۔ وہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی باتیں سوچتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو آسمان کے ستارے سمیٹ کر قوم وملت کی گود میں بھر دیں وہ ذروں کو آفتاب کا ہم سر اور قطروں کو دریا سے اعلیٰ و برتر دیکھنا چاہتے ہیں۔''(4)

کاروان رئیس القلم میں اپنے خیالات کا اظہار ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''رئیس القلم ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات گرامی اپنے آپ میں صد انجمن تھی۔ ایسی شخصیات برسوں بعد اس جہان فانی میں نزول کرتی ہیں۔ بقول میر تقی میرؔ:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

حقیقت یہی ہے کہ انسان تو وہی ہے جس کی زندگی انسانوں کے لیے نہ صرف مثالی بن جائے بلکہ ان کے جدو جہد اور مذہب وملت کے لیے ان کے کارہائے نمایاں مشعل راہ بھی بن جائیں۔ ارشد القادری کی شخصیت بھی ایسی ہی ہے جنھوں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مغربی اور افریقی ممالک تک علم وفضل کا چراغ روشن کیا۔ ان کے کارنامے اور ملک وقوم کے لیے ان کی خدمات کا بیان چند الفاظ میں ناممکن ہے۔''(5)

ارشد القادری قابل اعتماد، مستحکم اور دردمند محفلوں کی جان صحبتوں کے روحِ رواں تھے۔

ارشد القادری کا ایک روشن اور قابل قدر پہلو یہ ہے کہ وہ احسان شناس تھے۔ دوستوں کی مروّت اور احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ اور ہمیشہ کھلے بندوں اور بلا تامل اس کا اعتراف کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ اس معاملے میں سہواً ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی تو دلی تاسف کا اظہار کرتے۔ اگر احسان فراموشی قابل گرفت اخلاقی کمزوری ہے تو احسان شناسی یقیناً اخلاقی اقدار کے احترام کا ثبوت ہے۔ جس کسی نے ارشد القادری سے مروت روا رکھی اس کے سامنے ان کی آنکھیں جذبہ تشکر اور احسان مندی سے جھک گئیں۔

ارشد القادری کے ذہن میں بجلی کی سی تیزی، توانائی اور تب وتاب تھی۔ ان کا علم حاضر تھا اور حاضر جوابی مسلمہ جس طرح تحریر میں وہ ہمیشہ سر بلند رہے اسی طرح بحث مباحثے، نوک جھونک میں بھی وہ ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلتے تھے ان

کے ذہن کی تیزی و حدت اور شدت نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ ارشد القادری میں بلا کی شوخ طبع، بیخوفی اور بیبا کی تھی۔ ارشد القادری کے بارے میں مولانا یٰسین اختر مصباحی کا روان رئیس القلم میں تحریر کرتے ہیں:

''ارشد القادری کی زندگی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے قوم وملت اور جماعت کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور کہیں بھی چین سے نہیں بیٹھے انھیں میں نے جب بھی اور جہاں بھی دیکھا ہمیشہ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں پایا کہ جماعتِ اہل سنت کی سرگرمی کے لیے کس جگہ کون سا کام کیا جائے؟ کسی طرح اپنے لوگوں کو متحرک کیا جائے؟ اور کس طرح ان کے اندر جماعتی احساس وشعور کی روح پھونکی جائے؟ ان کے دیکھنے سننے والے ہزاروں لاکھوں افراد آج بھی گواہ ہیں کہ ارشد القادری کی ہر تقریر، ہر تحریر اور ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ جماعت کے لئے وقف تھا اور وہ اپنے فکری شعور، قلمی طاقت اور منصوبہ بندی کے باب میں فائق الاقران والا مثال تھے۔ اس لیے ان کی بارگاہ میں خراج عقیدت کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہوگا کہ ان کے کرب وسوز اور اضطراب مسلسل کو انفرادی طور پر نہ سہی اجتماعی طور پر باہم تقسیم کر لیا جائے اور ان کے مشن کو آگے بڑھایا جائے ان کے پیغام کو عام کیا جائے اور ہر لمحہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا اپنے آپ کو عادی بنالیا جائے۔''(6)

مولانا نعمان احمد اعظمی ازہری جنہیں ارشد القادری جیسے استاد کی شاگردی حاصل تھی اور اس وقت جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ارشد القادری کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی دینی، ملّی اور علمی خدمات محتاج تعارف نہیں اللہ تعالی نے انھیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ جہاں وہ سچے قائد قوم وملت تھے وہیں ایک پختہ قلم کار بھی تھے۔ ان کے قلم کی جولانی یہ تھی کہ قاری عش عش کر اٹھتا، زباں اتنی طیب و طاہر اور پاکیزہ کے غیروں نے اس کا برملا اعتراف کیا۔ لہجہ اور انداز بیان شائستہ وسنجیدہ کے اپنے اور بیگانے سب نے داد وتحسین سے نوازا، اس کے ساتھ ہی حقیقت نگاری میں آپ امتیازی شان کے مالک تھے جس کی جیتی جاگتی مثال آپ کی مشہور زمانہ تصنیف ''زلزلہ'' ہے۔''(7)

ارشد القادری کے دوسرے شاگرد مولانا فیضان المصطفی قادری جو اس وقت، ہیوسٹن امریکہ میں دعوتی فریضہ انجام دے رہے ہیں جنھیں ارشد القادری کی زندگی کے آخری دور میں ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے تعلیم و تربیت سے متعلق ہو یا اردو، عربی، انگریزی زبان و ادب سے واقفیت کا معاملہ ہو۔ ارشد القادری سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''صبح و شام بارگاہ میں حاضری ہوتی اپنی خدمت کم کراتے اور ہماری مشق و تربیت پر زیادہ توجہ دیتے کبھی فجر بعداور کبھی ظہر بعد پوری جماعت کو بلاتے اور جدید دینی تقاضوں کے مطابق مختلف موضوعات پر مناظرہ کرواتے جب بحث گرما گرم ہونے لگتی تو خود بھی فریق بن جاتے۔ مختلف بحثیں کبھی اردو میں کبھی انگریزی یا عربی میں ہوتیں۔ تبلیغ کے کام کو کس طرح موثر بنایا جاسکتا ہے اسے خوب سمجھاتے۔ طلبہ سے فارغ ہوتے تو مختلف دینی کاموں میں لگ جاتے ایک سے زیادہ بار میں نے آپ سے یہ فرماتے سنا 'وقت بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے۔''(8)

ارشد القادری اپنی دینی، علمی، قلمی اور تحریکی خدمات کے علاوہ اپنے منفرد اسلوب تحریر اور مذہبی تنقید نگاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک میں متعدد تحریکوں اور اداروں کی بنیاد ڈالی۔

اور بد مذہبوں سے کامیاب مناظرے کئے۔ وہ اپنے گرانقدر دینی، علمی اور قلمی کارناموں کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ڈاکٹر شکیل اعظمی ارشد القادری سے اپنی وابستگی کا اظہار جہان رئیس القلم میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''راقم السطور کو ارشد القادری مرحوم سے بارہا مختلف علمی و جماعتی موضوعات پر گفتگو کا شرف حاصل رہا۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کی مجلس شوریٰ میں بھی بہ حیثیت رکن تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کا اتفاق ہوا۔ علامہ پیش آمدہ معاملات و مسائل پر گہری تنقیدی نظر ڈالتے، ایجنڈے کے جملہ گوشوں کا گہرائی سے جائزہ لیتے، مسائل کا منطقیانہ حل پیش فرماتے، اور اپنے تجربات کی روشنی میں مفید مشوروں سے نوازتے۔ شوریٰ کی میٹنگ سے ہٹ کر بھی جب کبھی انس سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کو بے حد وسیع النظر، وسیع القلب، روشن خیال اور تعمیری ذہن کا حامل جماعتی و مشربی اختلافات سے بیزار اور اتحاد و اتفاق کا علم بردار پایا۔ ان کے دل میں ملت کا درد اور جماعت کے فروغ و استحکام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔''(9)

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب ارشد القادری ناگپور کے مدرسہ شمس العلوم میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اسی دوران شارق جمال ناگپوری نے وہاں داخلہ لیا اور ان سے تعلیم حاصل کی، ارشد القادری کی شخصیت سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا ارشد القادری مدظلہ تعالی کی شخصیت کافی جاذب نظر اور پرکشش تھی جو ایک مرتبہ آپ سے مل بیٹھتا، بار بار ملنے کی تمنا کرتا۔ ہر کسی سے محبت کے ساتھ ملتے۔ نرم لہجے میں گفتگو کرتے۔ مشفقانہ انداز گفتگو ہوتا۔

متاثر کرنے والا لہجہ ہوتا علم و ادب کے قدر دان تھے۔شعر و ادب سے گہرا تعلق تھا۔خود بھی اشعار کہتے اورادب دوستوں کوشعر فہموں کو سناتے۔عمدہ شعر تخلیق کرنے والوں کے نعتیہ شعر سنتے بھی تھے۔لیکن اس ادبی ذوق وشوق کے ہوتے ہوئے بھی ایک مخصوص حلقے میں رہے۔اپنے ادبی حلقے کو وسیع نہیں کیا شعری محفلوں سے خود کو دور رکھا۔یہ آپ کی انا نہیں تھی احتیاط وخود داری تھی لیکن اس احتیاط اور خودداری میں تکبر اور بڑائی کا غلط جذبہ یا عنصر نہ تھا کہ ایک دینی علمی مشن کو چلانے والی اہم اور بلند شخصیتوں میں سے آپ ایک تھے۔'' (10)

پیدائش -تعلیم و تربیت

ارشد القادری کی پیدائش 5/مارچ، 1925 میں اتر پردیش کے ضلع بلیا کے سید پورہ گاؤں میں ہوئی۔آپ کے والد ماجد کا نام مولانا شاہ عبد الطیف رشیدی تھااور دادا جان کا نام مولانا مکارم احمد تھا۔آپ کے والد سلسلۂ رشیدیہ کے سالک تھے اس لئے آپ کا نام غلام رشید رکھا گیا جو بعد میں ارشد القادری کے نام سے مشہور ہوئے ۔ارشد القادری کے نام سے متعلق مبارک حسین مصباحی جہان رئیس القلم میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا شاہ عبد الطیف صاحب نے سلسلہ رشیدیہ سے اکتساب فیض کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بیٹے کا نام غلام رشید تجویز کیا۔یہی نام اشرفیہ کے رجسٹر اور روداد میں بھی درج ہے۔مگر شہرت دوام قلمی نام ارشد القادری کے حصے میں آئی۔یعنی شاہ دیوان رشید کی مناسبت سے لفظ ارشد تجویز کیا اور سرکار بغداد کی نسبت سے القادری کا اضافہ کیا اور دونوں بزرگوں کے فیضان سے 'علامہ ارشد القادری' ہو گئے۔'' (11)

ارشد القادری دو بہنیں اور تین بھائی تھے۔ارشد القادری اپنے بھائی بہن کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں جسے خوشتر نورانی نے ترتیب وایڈیٹنگ کے بعد 'ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی' دہلی میں شائع کیا ہے:

''میری سگی ماں سے ہم لوگ تین بھائی تھے اور دو بہنیں، بہن سب سے بڑی تھیں، ہاجرہ خاتون جو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے عقد میں آئیں اور دوسری بہن نعمت النساء جو مولانا قاری رضاء المصطفٰی صاحب کی ساس ہیں۔ان کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب مولانا غلام آسی، اس کے بعد میں جب کہ تیسرے بھائی جو سب سے چھوٹے تھے انیس احمد ان کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا۔'' (12)

ابتدائی تعلیم و تربیت:

بسم اللہ خوانی 1930 میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد ماجد سے ہی حاصل کی۔ بعد میں گاؤں کے ہی پرائمری اسکول میں ان کا داخلہ ہو گیا اور وہاں انھوں نے درجہ سوم تک پڑھائی کی۔ اس کے بعد ان کے والد محترم نے ارشد القادری کو مولانا عظیم اللہ صاحب کے پاس جو رشتے میں ارشد القادری کے دادا لگتے تھے، گورہٹی بنگال جہاں وہ پڑھایا کرتے تھے بھیج دیا۔ وہ ایک زبردست خطیب اور نہایت منجھے ہوئے مدرس تھے۔ نحو وصرف ان کے خاص موضوع تھے۔ ان پر وہ ایسا درس دیتے تھے کہ جس کو انھوں نے پڑھا دیا وہ ان فنون میں یکتائے روزگار ہو جایا کرتا تھا۔ چونکہ ارشد القادری اردو وغیرہ اپنے گاؤں سے پڑھ کر آئے تھے اس لئے وہاں فارسی کی پہلی اور آمد نامہ سے شروعات کی۔ گلستاں اور بوستاں بھی وہیں پڑھی۔ گورہٹی میں گلستاں و بوستاں پڑھنے کے بعد وہ واپس اپنے گاؤں سید پورہ لوٹ آئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 8 سال کی تھی۔ اسی دوران ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ارشد القادری کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس زمانے میں ان کے والد محترم تجارت کی غرض سے دھنباد (جھارکھنڈ) میں رہا کرتے تھے۔

والدہ کے انتقال کے بعد ارشد القادری کی پرورش کا معاملہ پیش آیا چونکہ گھر میں رہنے والا کوئی نہیں تھا، اس لئے ان کے والد محترم نے دوسری شادی کی اور سب لوگوں کو لے کر وہ گاؤں سے دھنباد چلے آئے۔ دھنباد میں ان کی کتابوں کی دوکان تھی۔ جب والد محترم کمزور ہو گئے تو ارشد القادری کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگا دیا۔ اس طرح وہ کتابوں کی دوکان پر بیٹھنے لگے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ارشد القادری کتاب کی دکان پہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص وہاں سے گزرا اور ان سے کہا کہ میاں: صرف کتاب بیچتے ہی رہو گے یا پڑھو گے بھی؟ یہ کہہ کر تو وہ چلا گیا لیکن اس سے ان کے دل میں ایک ٹھیس سی لگی۔ اس حادثے کے بعد ان کا پڑھنے کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ چونکہ والد محترم کی استطاعت اتنی نہیں تھی کہ انھیں پڑھنے کے لئے باہر کہیں بھیجتے۔ اس لئے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ اس ارادے کے ساتھ وہ بھاگنے کی تیاری میں لگ گئے اور روزانہ کتاب کی دکان سے ایک پیسہ الگ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ جب دو روپے جمع ہو گئے تو ایک روز اہل صبح اپنا مختصر سامان جس میں ایک جوڑا پرانا کپڑا، ایک لنگی اور ایک لوٹا تھا ساتھ لے کر اسٹیشن چل پڑے۔ ارشد القادری الٰہ آباد جانا چاہتے تھے کیوں کہ ان کے بڑے بھائی مدرسہ سبحانیہ، سرائے گڑھی الٰہ آباد میں زیر تعلیم تھے۔ وہ کسی طرح بھولتے بھٹکتے ٹرین کے ذریعے پٹنہ ہوتے ہوئے الٰہ آباد مدرسہ سبحانیہ میں اپنے بڑے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ ارشد القادری جب بھائی سے ملے تو ان سے ساری روداد بیان کی اور بتایا کہ میں بابا کو بتائے بغیر بھاگ کر آیا ہوں۔ بھائی صاحب ان کے اندر تعلیم کا شوق دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے اچھا کیا۔ پھر وہیں ارشد القادری کا داخلہ انھوں نے کروایا۔ مبارک پور میں اشرفیہ نیا نیا قائم

ہوا تھا، دھیرے دھیرے اس کی مقبولیت پھیل رہی تھی۔ ارشد القادری کے چچازاد بھائی مولانا غلام محی الدین مبارک پور میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے بھائی صاحب نے تین چار مہینوں کے بعد مبارک پور پہنچا دیا اور انہی کے حوالے کر دیا۔ کسی طرح وہاں ان کا داخلہ ہو گیا، تعلیمی محنت اور نظموں کی وجہ سے حافظ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی کے خاص شاگردوں میں اپنا امتیازی مقام بنالیا۔ اس کے علاوہ انھیں مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری، مولانا غلام محی الدین بلیاوی، مولانا شمس الحق، مولانا عبدالمصطفیٰ ازھری، مولانا ثناء اللہ اعظمی، مولانا عبدالرؤف بلیاوی، مولانا محمد سلیمان کی شاگردی بھی حاصل رہی۔ مروجہ علوم وفنون کی تکمیل وہیں کی۔ 1944 میں دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ سے فراغت ہوئی۔ ان میں ارشد القادری پر جن کی زندگی کا سب سے گہرا نقش ہے وہ حافظ ملت کی ذات ہے اور اس کے بعد مولانا محمد سلیمان۔ چونکہ دوسرے اساتذہ طلبہ کی تربیت اور ذہن سازی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، انھوں نے سبق پڑھا دیا اور بس جبکہ حافظ ملت کا یہ عالم تھا کہ ان طلبہ کی نجی اور خاندانی زندگی سے بھی واقفیت ہوتی تھی اور وہ ان کی پریشانیوں کا حل بھی تلاش کرتے تھے۔ ارشد القادری کے عہد طالب علمی میں حافظ ملت نے ان کی بہت بڑی مدد کی، اقتصادی حالات کو دور کرنے کے لئے وہ انھیں اپنے ساتھ جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے کبھی کبھی انھیں اکیلے بھیج دیتے تھے۔

ارشد القادری نے اپنے استاد کی محبت اور شفقت کو صفحہ قرطاس پر یوں اتارا ہے۔ ''میرے برادر معظم حضرت مولانا شاہ غام آسی صاحب نے مجھے مبارک پور کی شہرۂ آفاق درسگاہ دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں پہنچا دیا۔ میرے طالع کی ارجمندی کہیے کہ وہاں مجھے جلالتہ العلم استاذ العلماء حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی آغوش تربیت مل گئی اور ان کے ظل ہمایوں میں ہم نے وہاں آٹھ سال گزارے۔ جب ایک سال کے لیے وہ ناگپور تشریف لے گئے تھے تو وہاں بھی مجھے خدمت میں حاضری کا شرف حاصل تھا۔ میرے پاس فکر وشعور اور علم وفن کی جو بھی پونجی ہے وہ انھیں کے علمی فیضان، روحانی توجہ اور ان کی مستجاب دعاؤں کی برکت ہے ان کی دلنواز شفقت ورحمت نے میری فکر کو بالیدگی میری زبان کو گویائی اور میرے قلم کو امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی کے مسلک عشق وعرفان کی ترجمانی کا شرف بخشا اور ان کی فکری تربیت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ باطل قوتوں سے مجھے لڑنے کا جذبہ عطا ہوا۔ یہ شرف بھی میرے لیے باعث افتخار ہے کہ الجامع الاشرفیہ مبارک پور کی علمی تحریک کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی حیات کے آخری لمحے تک میں ان کا معتمد اور ایک وفادار خادم کی طرح ان کے قدموں سے لگا رہا۔'' (13)

ازواج و اولاد:

ارشد القادری اس وقت ناگپور میں ہی تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ تب ان کی ہمشیرہ نے شادی کے

لئے بات چیت شروع کی اور پھر ان کے خالہ زاد بھائی عبدالوہاب صاحب کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا۔ اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اس لئے شادی کے تمام امور قادری منزل گھوسی سے انجام پائی۔ یہاں تک کہ بارات بھی قادری منزل گھوسی سے ہی نکلی۔ اس شادی میں حضرت صدر الشریعہ، حافظ ملت، مولانا عبدالمصطفیٰ ازھری، حافظ عبدالرؤف، مولانا غلام یزدانی، مولانا شمس الحق اور بھی بہت سے علما شریک تھے۔ اس بارات میں صدر الشریعہ اور حافظ ملت سمیت تقریباً 20 افراد تھے۔ بارات بذریعہ ٹرین اندرا اسٹیشن سے ''چل کہر'' تک گئی اس کے بعد وہاں سے لوگ بیل گاڑی کے ذریعہ قصبہ بلیار تسٹر تک گئے۔ گاؤں میں پہلی مرتبہ ان لوگوں نے مائک کا انتظام کروایا تھا، مائک پر ایک صاحب نے جب سہرا پڑھنا شروع کیا تو علاقے کے تمام لوگ آواز کو سن کر گھروں سے باہر نکل آئے کہ آخر یہ کیا چیز آ گئی۔ ارشد القادری کا نکاح صدر الشریعہ نے پڑھایا اور جب صبح کو بارات رخصت ہونے لگی تو ان کے والد ماجد پہنچے، کیونکہ اس وقت آنے جانے کے لئے ایک دو ٹرین اور بسیں ہوتی تھیں اور ان کی پہلی بس چھوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ وقت پر نہیں آ سکے۔ اس طرح ارشد القادری کی شادی خانہ آبادی مکمل ہو گئی۔ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی بیوی سے انھیں کوئی اولاد نہیں تھی دوسری بیوی سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

ارشد القادری کی دوسری شادی سے متعلق خوشتر نورانی 'ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی' میں لکھتے ہیں:

''حضرت ارشد القادری کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ دوسری شادی مولانا قاری حکیم شفیق احمد صاحب جو ڈونگر گڑھ صوبہ مدھیہ پردیش کے رہنے والے تھے ان کی صاحب زادی محترمہ عائشہ قادری سے ہوئی، پہلی زوجہ سے حضرت ارشد القادری کو کوئی اولاد نہیں تھی جبکہ مؤخر الذکر سے پانچ صاحبزادے جناب غلام ربانی، جناب فیض ربانی، جناب غلام جیلانی، ڈاکٹر غلام زرقانی اور غلام شعرانی ہوئے اور دو صاحبزادیاں سیما آسی اور زیبا قادری ہوئیں۔ موصوفہ نہایت نیک طینت، پاکباز اور صابرہ تھیں انھوں نے نہایت تنگدستی میں نہ صرف زندگی گزاری بلکہ تمام بچوں کی اچھی تربیت اور تعلیم کا بھی خیال رکھا اور کبھی اس فقر و فاقہ کا شکوہ نہیں کیا۔ حضرت ارشد القادری کی سیماب صفت شخصیت جو قوم و ملت کی ترقی، خوشحالی اور کامیابی کے لئے زندگی کی آخری سانس تک تڑپتی رہی اور اس فکر میں کبھی اپنے بچوں اور گھر کی بھی پرواہ نہیں کی لیکن انھوں نے کبھی اس پر اُف تک نہ کیا اور نہ کبھی حضرت ارشد القادری کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں رخنہ ڈالا۔ بقول حضرت علامہ ''اگر انھوں نے مجھے گھریلو زندگی سے بے نیاز نہ کیا ہوتا تو شاید میں عالمی سطح پر اپنی قوم اور ملت کے لیے اتنا کچھ نہ کر پاتا۔'' اس حیثیت سے اگر ہم موصوفہ کی حیات کا جائزہ لیں تو حضرت ارشد القادری کے لافانی کارناموں میں وہ برابر کی

حصے دار ہیں۔ ان کی لمس نیک بختی کے طفیل ان کا انتقال 1989ء میں رمضان کی 26 تاریخ کو ہوا، جب کہ تدفین 27ویں شب بروز پیر کو جمشید پور میں عمل میں آئی جو شب قدر بھی کہلاتی ہے۔''(14)

درس و تدریس:

تکمیل درس کے بعد ارشد القادری نے 1945 تک تدریسی خدمات انجام دی۔ 1960 کے بعد اپنی وفات سے چند برسوں قبل تک وقتاً فوقتاً درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ چونکہ ان کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ ہر محاذ پر وہ کامیاب ہوتے گئے ان کی اس کامیابی میں اپنی محنت، دانش مندی اور خانفشانی بھی شامل ہے۔ ارشد القادری کی شخصیت سازی میں سب سے اہم کردار ان کے استاد گرامی حافظ ملت کا رہا ہے۔ شروع سے آخر تک انھوں نے ان کی رہنمائی کی۔ ارشد القادری اپنے استاد کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تاج محل کی تعمیر آسان ہے لیکن شخصیتوں کی تعمیر کا کام بہت مشکل ہے حافظ ملت کو اس کام سے عشق کی حد تک تعلق تھا، سفر میں حضر میں حلقہ درس میں مجلس خاص میں، جلسۂ عام میں کہیں وہ ایک لمحے کے لیے اپنے فریضۂ عشق سے غافل نہیں رہتے تھے، تاریخ میں مصلحین واساتذہ کی زندگیوں کے جو بے شمار واقعات محفوظ ہیں ان میں شخصیت سازی سے متعلق بکھرے ہوئے جزئیات کا اگر آپ گہرا مطالعہ کریں تو آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ شخصیت سازی کے لیے کسی معلم و مصلح میں ان پانچ اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ (1) شفقت (2) ذہانت (3) تدبر (4) علم (5) تقویٰ۔ اور حقائق و واقعات شاہد ہیں کہ یہ پانچوں اوصاف حافظ ملت کی زندگی میں ابھرے ہوئے نقوش کی طرح نمایاں ہیں۔''(15)

بہت کم ہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں حافظ ملت جیسا شفیق استاد ملتا ہے۔ ارشد القادری کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہے اور ان کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں ان کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ 1937 میں فتح پور (یو۔پی) سے جب الحاج علامہ، مفتی عبدالرشید خاں فتح پوری فتح پور سے ناگپور تشریف لائے اور یہاں کی دینی تعلیمی کمی کو محسوس کیا تو ایک چھوٹے سے محلے میں کرائے کا مکان لے کر ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنیاد رکھی۔ پھر جلد ہی صاحب حیثیت لوگوں کے مالی تعاون سے محلّہ نعل صاحب میں ایک بڑا مکان خرید کر چھوٹے مدرسے کو 'جامعہ عربیہ اسلامیہ' کا مبارک نام دے کر مذہبی، دینی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنے زمانے کے اسی دینی علوم کو واحد مرکز 'جامعہ عربیہ اسلامیہ' میں ارشد القادری، مدرسہ جامعۃ الاشرفیہ سے سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد 1944 میں تشریف لائے۔ اور اسی مدرسے میں اپنی تدریسی خدمات کا مبارک سلسلہ شروع کیا۔ ارشد القادری اس دینی ادارے

سے کسی خاص وجہ سے تین سال بعد ہی الگ ہوکر بہ رضا و رغبت مدرسہ الاسلامیہ، مومن پورہ میں چلے گئے۔ یہاں شبینہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ انھوں نے اس شبینہ مدرسے سے اپنے دینی علمی مشن کو شروع کیا۔ اس موقع پر استاد حافظ ملت بھی تشریف لائے تھے۔ انھیں کی ایما پر یا خود ان کے کہنے پر اس مذکورہ مدرسے کا نام ''شمس العلوم'' رکھا گیا۔

مدرسہ شمس العلوم مومن پورہ، ناگپور میں ناظرہ، حفظ قرآن کریم اور درس نظامی پڑھانے کا خاص اہتمام سے سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ ارشد القادری خود بخاری شریف، شرح وقایہ کا درس طلبا کو دیتے تھے۔ آپ کے زمانے میں جو طلبہ تھے یا جو آپ کے تلامذہ تھے ان میں مفتی جلال الدین احمد امجدی، مولانا محمد یسٰین صاحب، مولانا صفی اللہ بنارسی صاحب، مولانا رحمت اللہ صاحب، راشد احمد آبادی اور عبد الجلیل صاحب خاص طور سے قابل ذکر طلبہ شمار ہوتے ہیں۔ علم دین کے حاصل کرنے کی ایک لہر تھی جس کے تحت طلبہ کھنچے چلے آرہے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ دور دراز کے علاقوں سے بھی مدرسے میں داخلے کے لئے علم دین کے طالبوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس مدرسے کے سلسلے میں حضرت علامہ نور اللہ مرقدہٗ کی قربانیاں بھی بہت تھیں۔ ایک دارالیتٰمی بھی قائم کیا تھا، جس میں غریب باپ کی علم دین سے شوق رکھنے والی اولاد کے مستفید ہونے کے کافی روشن مواقع تھے۔

1952 میں حافظ ملت نے جمشید پور کا دورہ کیا اور اس شہر میں علم دین کی کمی اور بدعقیدگی کو محسوس کیا۔ میرا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ آج بھی نصف صدی گزر جانے کے بعد جھارکھنڈ کے دیہی علاقوں میں علم دین سے ناواقفیت اور غیر اسلامی رسم و رواج کا چلن ختم نہیں ہوسکا ہے۔ جمشید پور کی عوام نے حافظ ملت سے گزارش کی کہ آپ کسی عالم دین کا انتظام کردیں تاکہ یہاں بھی علم کی روشنی پھیل سکے۔ انھیں وجوہات کے سبب حافظ ملت نے علامہ کو خط لکھ کر جمشید پور آنے کی دعوت دی۔ مدعائے نگارش کچھ اس طرح تھا:

> ''اے میرے معتمد تلمیذ مبارک ہو! کارساز عالم نے تمھیں ایک بڑی جانگسل دینی خدمت کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔ خط پاتے ہی مدرسہ سے سبک دوشی کی اخلاقی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جاؤ اور اولین فرصت میں بہار کے عروس البلاد جمشید پور چلے جاؤ۔ وہاں تم جیسے پرعزم جواں سال مبلغ کی شدید ضرورت ہے، لیکن آنے سے پہلے مدرسہ شمس العلوم ناگپور کے تدریسی اور تربیتی نظام کو سنبھالنے کے لیے اپنی جگہ کوئی مناسب انتظام ضرور کردینا۔ اس لیے کہ چراغ سے چراغ جلانا کارخیر ہے لیکن ایک چراغ بجھا کر دوسرا چراغ روشن کرنا ایک داعی اسلام کے لئے دانش مندانہ اقدام نہیں۔'' (16)

یہ خط ارشد القادری کے لئے حکم نامہ ثابت ہوا اور اپنے استاد کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ارشد القادری نے مدرسے کے ناظم سے جمشید پور جانے کی اجازت طلب کی۔ ناظم ادارہ نے حالات کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے اجازت

دیدی اورارشد القادری سے یہ بھی گزارش کی کہ اگر حالات زندگی کے کسی موڑ پر بھی اجازت دیدیں تو ہماری آنکھیں آپ کے لئے ہمیشہ فرش راہ رہیں گی اور ہمارے دلوں کے دروازے آپ کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ 1952 میں اپنے چند ہونہار طلبہ کو ایک جلسے میں دستار فضیلت سے سرفراز فرما کر اپنے ارادت مندوں اور احباب کو نیز سعادت مند تلامذہ کو ملول اور رنجیدہ حالت میں چھوڑ کر سرزمین جمشید پور (ٹاٹا نگر) کی طرف کوچ فرمایا۔

ارشد القادری جب جمشید پور کے حدود میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ جمشید پور میں ان کے ایک شناسا عالم دین امامت و خطابت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ کسی طرح ان کی مسجد تک پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو امام صاحب بڑے تپاک سے ملے اور خوش آمدید کہا۔ رسمی گفتگو کے بعد جب امام صاحب نے جمشید پور تشریف لانے کا مقصد پوچھا تو، ارشد القادری صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے کہ استاذ گرامی حافظ ملت نے دین وسنیت کی خدمت کے لئے بھیجا ہے۔ چونکہ انھیں خود ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کہاں سے کرنا ہے۔ ارشد القادری نماز فجر کے بعد امام صاحب کو ساتھ لے کر مسجد سے نکل گئے اور دن بھر مسلم محلوں کا جائزہ لیتے رہے۔ لیکن کوئی کامیابی نہیں مل سکی۔ دوسرے دن پھر جمشید پور کے گلی کوچوں میں منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔ محلّہ دھتکیڈیہہ کے ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر ایک دروازے کی جلی تحریر پر پڑی جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔ ''یا سلطان الہند غریب نواز المدد'' ارشد القادری کسی پس وپیش کے بغیر گھر کے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کے سلام کی آواز آئی۔ ارشد القادری نے کسی تمہید کے بغیر ارشاد فرمایا، اس گھر کے ذمہ دار کون ہیں، نوجوان نے اپنے والد گرامی کا نام بتاتے ہوئے کہا وہ اس وقت گھر پر نہیں ڈیوٹی پر تشریف لے گئے ہیں۔ وہ شام کو ذرا دیر سے تشریف لاتے ہیں صبح نو بجے تک ان سے ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ صبح نو بجے سے پہلے ہی ارشد القادری جناب ضمیر الدین صابری صاحب کے دروازے پر کھڑے تھے اور دستک دے کر ان کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ضمیر الدین صابری صاحب پہلی ہی ملاقات میں بڑے چاؤ سے ملے رسمی گفتگو کے بعد تشریف آوری کا مدعا دریافت کیا۔ ارشد القادری نے اپنے مخصوص مسحور کن انداز میں صرف اتنا کہا: ہم آپ کے محلے میں ایک دینی مدرسہ چلانا چاہتے ہیں۔''

ضمیر صاحب کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے کام کی شروعات کیسے ہوگی۔ ارشد القادری نے قیام مدرسہ کا آسان حل نکالتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ آپ کے دروازے پر جو یہ برآمدہ خالی پڑا ہوا ہے اس میں درسگاہ لگانے کی اجازت دیدیں۔ اللہ تعالیٰ کوئی مناسب سبیل پیدا فرمادے گا تو مدرسہ اپنی جگہ میں منتقل ہو جائے گا۔ صابری صاحب نے کہا: یہ گھر آپ کا ہے اس کار خیر میں مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ فرط مسرت سے ارشد القادری کی پیشانی چمک اٹھی۔ اور پھر صبح ہی سے قاعدہ بغدادی کے چند بچوں کو لے کر درسگاہ کا آغاز کر دیا۔ ارشد القادری نے

محلّہ دھتکیڑ یہہ کے کبیر یہ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے رضامندی کے بعد وہاں کے ذہین اور محنتی طلبہ کو بلا کر آپ نے علم و اخلاق کے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی تقریریں بچوں کو یاد کرادیں۔ اس کے بعد آپ نے محلّہ کے ایک کھلے مقام پر ''جشن تعلیمی'' کا اعلان فرما دیا۔ اور بڑے اہتمام سے طلبہ کے والدین محلّہ کے ذمہ داران کو خصوصی دعوت دی اور عمومی اعلان کے ذریعہ مسلمانان جمشید پور کو بھی مدعو کیا۔ محلّہ والوں کے لئے یہ پروگرام بالکل نیا تھا۔ لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ جلسہ میں شریک ہوئے۔ آپ نے جلسہ کی شروعات قرآن پاک کی تلاوت سے کی اور جلسے کی انعقاد پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد کبیر یہ مڈل اسکول کے طلبہ کی تقریروں کا سلسلہ شروع کرادیا۔ غیر متوقع طور پر اپنے ہی بچوں سے اسلامیات و اخلاقیات کے موضوع پر تقریریں سن کر اہل محلّہ ششدر رہ گئے۔

بچوں کی تقریروں کا سلسلہ ختم ہوا تو پورا مجمع ارشد القادری کی تقریر سننے کے لیے سراپا اشتیاق تھا۔ آپ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد ارشاد فرمایا۔ آج قوم مسلم اپنی علمی پسماندگی کی وجہ سے سیاسی اور معاشی طور پر کتنی پیچھے چلی گئی ہے یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے، کبھی اس ملک میں ہماری شوکت اقتدار کا پرچم لہراتا تھا۔ مگر گردش لیل و نہار نے ہمیں پستی کی اس منزل تک پہنچادیا کہ ایوان اقتدار کے سایہ میں کھڑا ہونا بھی میسر نہیں۔ اس میں ہماری دینی بیزاری اور علمی تہی دامنی کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اے لوگوں! مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اگر صبح کا بھٹکا شام کو گھر پہنچ جائے تو اسے بھٹکا ہوا نہیں کہتے۔ ارشد القادری نے اور دوسرے مسائل پر بھی پر زور تقریر کی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کے محلّہ میں ایک ایسا مدرسہ کھولا جائے جس میں عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی بھرپور نظم ہو آپ کے خصوصی تعاون سے اس منصوبے میں اگر کامیابی مل گئی تو ہمارا پورا معاشرہ دینی و دنیوی برکتوں میں نہا جائے گا۔ اور ہماری نئی نسلوں کے قدم آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے نظر آئیں گے، سنجیدہ گفتگو نے غیر اختیاری طور پر جذبات کا رخ اختیار کرلیا اور پورے مجمع پر وجدانی لہر دوڑ گئی، اور ہر طرف سے ایک شور الرحیل اٹھا۔ مدرسہ قائم ہوگا۔ مدرسہ ضرور قائم ہوگا۔ علامہ صاحب نے سنجیدہ رخ اختیار کرتے ہوئے فرمایا، حضرات! جذباتی نعروں سے کسی قوم کا مقدر نہیں بدلتا۔ سر دست آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے، کل صبح اپنے اپنے بچوں کو ہمارے مکتب میں داخل کرائیں۔ چشم دید شاہدین کا بیان ہے کہ مائیں جس طرح عید کے دن اپنے بچوں کو جلدی جلدی عید گاہ جانے کے لئے تیار کرتی ہیں۔ صبح کو پورے محلے میں بالکل وہی منظر تھا۔ جب ارشد القادری بر آمدہ میں داخلہ رجسٹر لے کر بیٹھے تو دو پہر تک نو داخل طلبہ کا نام ہی درج کرتے رہے، اور آخر میں

جب صرف پہلے ہی دن کے نو داخل طلبہ کی فہرست شمار کی گئی تو ان کی تعداد 360 تھی۔'' (17)

چار سال تک سڑکوں کے کنارے، دیواروں کے سائے میں کھلے آسمان کے نیچے ایک گشتی درسگاہ کی طرح تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی درمیان ارشد القادری کی انتھک کوششوں سے ٹاٹا اسٹیل کمپنی فیض العلوم کی عمارت کے لیے زمین الاٹ کرنے پر تیار ہوگئی۔ چنانچہ فروری 1957 میں مشاہیر علماء و مشائخ کے مقدس ہاتھوں سے فیض العلوم کی عالیشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

ارشد القادری اور جامعہ فیض العلوم :

مدرسہ فیض العلوم ارشد القادری کی دوسری اور سب سے بڑی کامیابی ہے، انھوں نے اس کی کامیابی اور ترقی کی حصولیابی کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی انھوں نے اس کی خدمت پورے نصف صدی تک کی بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ آخری دم تک اس مدرسے کی سرپرستی کرتے رہے۔ارشد القادری نے اپنے خونِ جگر سے اس گلشن کی آبیاری کی۔

مفتی عابد حسین مصباحی ارشد القادری اور جامع فیض العلوم کے متعلق لکھتے ہیں :

''ارشد القادری 1373ھ/ 1952ء میں علم وفن، علم مروت اخلاق و کردار اور عزم و استقلال کا ہمالہ بن کر حضور حافظ ملت کے حکم سے مشرقی ہند کے ایک شہر جمشید پور میں تشریف لائے اور کھلے آسمان کے نیچے مدرسہ فیض العلوم کی بنیاد رکھی اور درس و تدریس اور تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ جاری کیا اور اپنے خون جگر سے ویرانے میں دین کا گلشن لہلہایا سنگلاح کو سبزہ زار کیا اور سنگریزوں سے ہیرے تراش کر عالم اسلام میں پھیلا دیئے۔''(18)

جامعہ فیض العلوم۔ ایک تعارف

(1) حافظ ملت کے حکم پر ارشد القادری نے 1952 میں کھلے آسمان کے نیچے مدرسہ فیض العلوم کی بنیاد رکھی۔

(2) 3 سال کی لگاتار کوشش کے بعد 31 / مارچ، 1955 کو ٹاٹا اسٹیل کمپنی نے فیض العلوم کی عمارت کے لئے زمین الاٹ کیا۔

(3) 15 فروری 1957 کو حافظ ملت اور دیگر علماء اہلسنت کے مقدس ہاتھوں سے دو منزلہ عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔

(4) 1960 میں ایک منزل مکمل ہونے کے بعد فیض العلوم کی درسگاہ اپنی ذاتی عمارت میں منتقل ہوگئی۔

(5) مسلمان بچوں کو صنعتی تعلیم و تربیت کے ذریعے خود کفیل بنانے کے لئے جون 1972 میں فیض العلوم ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔

(6) 1973 میں مدرسہ فیض العلوم کی عمارت کی دوسری منزل پایہ تکمیل کو پہنچی۔

(7) بیرونی طلبہ کی رہائش کے لئے 6 / مارچ ,1970ء کو ٹاٹا اسٹیل کمپنی سے ہوسٹل بلڈنگ کے لئے زمین حاصل کی گئی۔

(8) حضور مفتی اعظم ہند نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اپریل 1974 میں ہوسٹل کی دو منزلہ عمارت کی بنیاد رکھی۔

(9) یکم جنوری 1970 کو فیض العلوم اردو مڈل اسکول کا قیام عمل میں آیا۔

(10) 1977 میں ہاسٹل بلڈنگ کی ایک منزل مکمل ہوگئی۔

(11) صنعت وحرفت کی مختلف شاخوں میں مسلم ماہرین کی صلاحیتوں کو ملی اور قومی مفاد میں استعمال کرنے کے لئے 1973 میں فیض العلوم ٹیکنیکل ایڈوائزری کے نام سے ایک مشاورتی ادارہ قائم کیا گیا۔

(12) فیض العلوم نے انجمن فیضان ملت کے نام سے طلبہ کی ایک انجمن قائم کی جس کے تحت ہزاروں کتابوں پر مشتمل ایک عظیم لائبریری چل رہی ہے اور جس کے زیر اہتمام ہر سال 12 ربیع النور کے موقع پر نہایت کروفر اور تزک واحتشام کے ساتھ جلسہ وجلوس کی شکل میں نبی کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار منائی جاتی ہے۔

(13) 21 فروری 1997 کو ارشد القادری نے بنفس نفیس دیگر علماء کی معیت میں فیض العلوم مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کی فلک بوس دو منزلہ عمارت آج بھی آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور مسجد کی زمین کے حصول میں مسلسل 16 سال ارشد القادری نے کوشش کی اور صرف ایک روپیہ میں بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرساد سے حاصل کی جبکہ اس زمیں کی قیمت دو کروڑ سے کم نہیں ہے۔ یہ مسجد مشرقی ہند میں سب سے زیادہ وسیع وعریض اور بے مثال ہے۔ روز نامہ ہندوستان ٹائمس کے مطابق پورے جھارکھنڈ میں سب سے بڑی مسجد ہے۔

جامعہ فیض العلوم — خدمات اور کارنامے

1952 سے اب تک فیض العلوم نے چار ہزار سے زائد اپنے علماء، حفاظ، قراء، خطباء اور اصحاب قلم پیدا کئے جو آج ملک کی معیاری درسگاہوں، مسجدوں، اداروں اور تبلیغی مرکزوں میں دین کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

چھ ہزار سے زائد طلبہ فیض العلوم کے درس عالیہ کے شعبے سے فارغ ہوئے جن میں سے سیکڑوں طلبہ ہائی اسکولوں اور وہاں کی ڈاکٹری، انجینئرنگ اور علم وفن کی مختلف شاخوں میں کامیابی حاصل کی۔ نوجوانوں کے کئی گروپ فیض العلوم ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ سے تربیت حاصل کر کے صنعت وحرفت کے مختلف میدانوں میں آج خوشحالی کی زندگی

گزار رہے ہیں۔ مشرقی ہند کے مختلف صوبوں میں فیض العلوم نے اپنی کئی درجن شاخوں کے ذریعے لاکھوں افراد تک دین کی روشنی پہنچائی اور ہزاروں بچوں کو علم دین کی راہ پر لگایا اور سینکڑوں آبادیوں کو اسلام کی برکت سے مالا مال کیا۔ ہند اور بیرونی ہند میں اسلام کے فروغ و ترقی اور دائرہ عمل کی مختلف سطحوں پر مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے فیض العلوم ایک عظیم مرکز عمل کی حیثیت سے ہمیشہ پیش پیش رہا۔ فیض العلوم کے ذریعہ بہار، جھارکھنڈ اور اڑیسہ کے کروڑوں مسلمانوں میں جو جماعتی، تنظیمی، مذہبی اور تبلیغی شعور پیدا ہوا وہ ایک مسلم حقیقت کی طرح نا قابل انکار ہے۔ فیض العلوم کی تحریک و تعاون سے مشرقی ہند کے کئی لاکھ مربع میل علاقوں میں بے شمار مساجد، مدارس، اسکول، قبرستان اور اداروں کی عمارتیں وجود میں آئیں جو آنے والی نسلوں کو اسلام اور اسلام کی روایت کے ساتھ مربوط رکھیں گی۔

فیض العلوم میں مندرجہ ذیل شعبے ہیں۔

(1) جامع فیض العلوم درسگاہ نظامیہ

(2) فیض العلوم اردو گرلز اینڈ بوائز ہائی اسکول

(3) فیض العلوم ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ

(4) فیض العلوم مکہ مسجد

(5) فیض العلوم مرکز کتابت

(6) فیض العلوم مڈل اسکول

(7) فیض العلوم انجمن فیضان ملت

(8) فیض العلوم دارالافتاء

(9) فیض العلوم نشر و اشاعت

(10) فیض العلوم شعبۂ حفظ و قرأت۔

فیض العلوم آج بھی اپنی منزل کی طرف تیزی سے گامزن ہے اس کی اہمیت و افادیت مکمل طور پر واضح ہے۔ یہ صرف جھارکھنڈ کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل فخر ہے۔ مفتی عابد حسین مصباحی فیض العلوم کی کامیابی اور اس کی عظمت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''فیض العلوم نے اپنے پچاس سالہ دور میں ایسے نادر روزگار علماء و فضلاء کو تیار کر کے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا جو اپنے وقت کا کوئی واعظ ہے تو کوئی مسجد کا امام، کوئی شاعر ہے، تو کوئی

ادیب، کوئی مبلغ ہے تو کوئی مناظر، کوئی حافظ ہے تو کوئی قاری، کوئی محدث ہے کوئی فقیہ اور کوئی زبردست مفتی۔ فیض العلوم کی زیر تربیت پلنے والی یہ وہ جماعتیں ہیں جو اسلامی بقا، مسلک اعلیٰ حضرت کے فروغ و استحکام میں ہمہ تن اپنے اپنے مقام میں مصروف ہیں۔ ضلالت و گمراہی کی تیز تر آندھیوں، طوفانوں اور بجلیوں کے ہجوم میں بھی اپنے کاروان حیات کو آگے بڑھاتے رہے ہیں اور کائنات علم و فضل کو شاداب کرتے ہیں۔ جو ایک طرف سلیم الطبع قلوب وادیاں کو عشق رسالت کی خوشبوؤں سے معطر کرتے ہیں تو دوسری طرف نیزہ رضا کی مار سے عقائد کفریہ اور تحریکات باطلہ کو کیفر کردار تک پہنچا رہے ہیں۔'' (19)

جامعہ فیض العلوم نے کئی شاخوں اور تعلیمی اداروں کو جنم دیا ہے ان میں سے کئی ادارے کو آزاد و خود مختار بھی کیا اور کئی ادارے آج بھی اس کی آغوش نگرانی میں پروان چڑھ رہے ہیں: (1) جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی (2) ادارۂ شرعیہ، پٹنہ (3) مدرسہ تنویر الاسلام، ٹیلکو (4) مدرسہ عزیز العلوم، جگسلائی (5) مدرسہ عزیز الاسلام، رانی کو در (6) مدرسہ دارالاسلام، آزادنگر (7) فلاحی مرکز، آزادنگر (8) اسلامی مرکز، رانچی (9) مدرسہ گلشن بغداد، ہزاری باغ (10) مفتاح العلوم، راورکیلا (11) دارالعلوم مخدومیہ، گوہاٹی، آسام قابل ذکر ہیں۔

ارشد القادری اور ادارۂ شرعیہ—پٹنہ

آزادی کے بعد خصوصاً ریاست بہار کے مسلمان درد و کرب میں مبتلا تھے۔ ان کا کوئی مذہبی، ملی، شرعی، ثقافتی، علمی اور تہذیبی مرکز نہیں تھا جہاں جا کر اپنی عائلی زندگی کے مسائل، آپسی تنازعات اور ملکی و ملی معاملات کے حل کے لئے رہنمائی حاصل کرتے۔ خصوصاً طلاق، فسخ نکاح، وراثت و ہبہ اور قانون شرعیہ کی روشنی میں ریاست کے 85 فیصد مسلمانوں کو پریشانیاں لاحق ہونے لگیں۔

ایسے ماحول میں مسلمان رہنمائی کی مزید شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کرنے لگے۔ جس درد کو ارشد القادری نے محسوس کیا اور ایک ہمہ گیر تصور اپنے ذہن و فکر میں نقش کیے جسے زمین پر اتارنے کے لئے خاکہ تیار کیا بالآخر وہ وقت آ ہی گیا۔

ارشد القادری نے مذکورہ مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے مورخہ 10,11,12 مئی 1968 کو بہار کی سرزمین سیوان میں سہ روزہ صوبائی سنی کانفرنس مفتی اعظم ہند کی صدارت میں انعقاد فرمایا جس میں تاج الشریعت حضور مفتی اعظم ہند، برہان ملت حضرت علامہ برہان الحق، سید العلماء حضرت مولانا سید آل مصطفےٰ، حافظ ملت الشاہ عبد العزیز مجاہد ملت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن، امین شریعت حضرت مفتی محمد رفاقت حسین، شمس العلماء مفتی شمس

الدین، علامہ محمد سلیمان، حضرت مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری، نعیم الاسلام مولانا نعیم الدین اور مجاہد دوراں حضرت مولانا مظفر حسین کچھوچھوی اور پندرہ سو جید علماء کے علاوہ تین لاکھ مسلمانوں نے شرکت فرمائی۔

اس کانفرنس کا انعقاد صوبہ بہار خصوصاً سیوان و اطراف کے محبین، مخلصین اور ابو سہیل امین شریعت دوئم حضرت مفتی انیس عالم قادری کے تعاون و اشتراک سے عمل میں آیا تھا۔

اسی تاریخ ساز کانفرنس میں مذکورہ اکابرین اور لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں کانفرنس کے اختتام پر مورخہ 12 مئی، 1968ء بوقت صبح صادق دین و شریعت کا محافظ ''ادارۂ شرعیہ'' کی بنیاد ارشد القادری نے اپنے دست مقدس سے رکھی تھی۔

ادارۂ شرعیہ کے قیام پر اس کے اغراض و مقاصد اور نظام قضاء و افتاء پر مشتمل ایک قرار داد منظور کی گئی تھی جس پر اکابرین ملت نے دستخط فرمایا۔ دریں اثناء کچھ علماء اور عوام الناس کی رائے تھی کہ ادارہ کا مرکزی دفتر سیوان میں رکھا جائے مگر ارشد القادری کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ بہار کے علاوہ ملک کے کونے کونے سے مسائل شرعیہ کے حل کے لئے آنے والے مسلمانوں کو پریشانیاں ہوسکتی ہیں اس لئے انھوں نے بہار کی مرکزی جگہ پٹنہ میں دفتر کھولے جانے کی تجویز رکھی جس پر اتفاق رائے ہوا اور ارشد القادری سیوان سے مفتی انیس عالم الحاج منے میاں اور دیگر مخلصین کے ہمراہ پٹنہ تشریف لائے اور مورخہ 14 مئی، 1968 کو نور منزل، دریا پور سبزی باغ، پٹنہ، بہار میں ایک سو بیس روپئے ماہانہ کرایہ پر ادارۂ شرعیہ کے دفتر کا افتتاح فرمایا جس کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ارشد القادری نے الحاج غلام رضا عرف منے میاں کے سپرد فرمائی اور ادرہ کے دست و بازو کی حیثیت سے شاہ برہان احمد مولانا قیس محمد خان مفتی عبد الحافظ رضوی، مولانا راشد القادری اور مولانا دستگیر وغیرہم کو دینی امور کی انجام دہی پر مامور فرمایا۔ ادارہ شرعیہ کا دفتر کئی جگہوں پر منتقل ہوتا رہا۔ بالآخر ارشد القادری کی کوششوں سے نوگھرواں، سلطان گنج نزد سلطان گنج، تھانہ پٹنہ میں ڈیڑھ کٹھہ قطعہ اراضی حاصل ہوئی۔

اور آج ادارہ شرعیہ بہار پرشکوہ چار منزلہ عمارت 18 کمروں اور دو بڑے ہال پر مشتمل ہے جو ارشد القادری کی خدمات جلیلہ کا زندہ ثبوت ہے۔

ادارہ شرعیہ مسلمانوں کی ایک مذہبی تعلیمی اور سماجی تنظیم ہے جو قیام سے لے کر تا ہنوز پورے ملک میں خصوصاً ریاست بہار میں مذہبی و تعلیمی خدمات کے ساتھ ملک کی سالمیت استحکام و ترقی اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے کاموں میں کارہائے نمایاں انجام دیتا چلا آرہا ہے۔

ادارہ کو جن مقاصد کی تکمیل کی خاطر وجود بخشا گیا تھا وہ آج بھی اپنے تمام تر شعبوں کے ساتھ مجلس شوریٰ، مجلس

Jawaharlal Nehru University Library

منتظمہ، منیجنگ ٹرسٹی، معاونین ومخلصین اور اساتذہ وطلبہ کے باہمی اشتراک وتعاون سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ادارہ شرعیہ کے قیام کا مقصد پیغمبر اسلام کے عطا کردہ نظام کی پیروی اور پاسداری، قوانین اسلام کو نافذ العمل، اشاعت دین، مسلمانوں کے مذہبی، آئینی اور ملی حقوق کی حصولیابی ملک کے قومی ہم آہنگی کے استحکام، اصلاح معاشرہ، آپسی تنازعات کا سد باب اور عائلی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے جہد مسلسل کرتے ہوئے مضبوط و مستحکم عملی اقدام اٹھانا ہے۔ سربراہ اعلی ارشد القادری نے مذکورہ اغراض کی تکمیل کے لئے ادارہ شرعیہ میں مختلف شعبوں کی تشکیل فرمائی۔ جس کی اجمالی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(1) **دارالقضاء**— یہ ایک شرعی عدالت ہے جہاں قاضیان شریعت کے ذریعہ نکاح وطلاق، وراثت وہبہ، خلع وفسخ نکاح اور پیش آنے والے باہمی نزاعات کے فیصلے کیے جاتے ہیں، فقہی قوانین اور شرعی عدالتوں کے اصول وضوابط کے مطابق جس عدل واحتیاط کے ساتھ یہاں مقدمات کی سماعت اور فیصلے کی طریقۂ شرعی رائج ہے وہ منفرد نوعیت کے متحمل ہے۔ مرکزی دارالقضاء کے علاوہ ریاست بہار، جھارکھنڈ، بنگال، اڑیسہ اور مہاراشٹر سمیت ملک کے 35 مقامات پر دارالقضاء قائم ہیں اور وہاں قضاۃ مقرر کئے گئے ہیں۔ صرف بہار، جھارکھنڈ اور اڑیسہ میں 24 مقامات پر بقیہ دیگر صوبوں میں مرکزی دارالقضاء کی شاخیں قائم ہیں۔

(2) **دارالافتاء**— اس شعبہ سے شرعی احکام وفقہی مسائل پر مشتمل فتاوے صادر کئے جاتے ہیں، ملک و بیرون ملک سے آنے والے ہزاروں سوالات کے جوابات قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں دیئے جاتے ہیں۔

(3) **مدرسہ شرعیہ**— یہ ادارۂ شرعیہ کا تعلیمی شعبہ ہے جہاں مقامی و بیرونی طلبہ کو رہائش اور خورد ونوش کی کفالت کے ساتھ حفظ وقرات، عقائد ومسائل اور قومی ہم آہنگی کی تعلیم دی جاتی ہے نیز انھیں تقاریر ومواعظ کی تربیت کے مراحل سے گزارا جاتا ہے تاکہ وہ مساجد میں امامت کے فرائض نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس شعبے سے ہر سال ایسے طلبہ خاصی تعداد میں فارغ ہوتے ہیں۔ دینی تعلیم کے علاوہ انھیں عصری تعلیم وتربیت سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے، اس شعبے کے تحت تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ذیلی مکاتب مدارس قائم کئے جاتے ہیں اور ادارۂ شرعیہ بہار کے زیر نگرانی تقریباً 150 مکاتب ومدارس چل رہے ہیں۔

(4) **شعبۂ تبلیغ**— اس شعبہ کے زیر اہتمام مسلمانوں کو دینی احکام ومسائل اور صحیح عقائد واعمال سے باخبر کیا جاتا ہے۔ غیر قوموں تک دعوت اسلام مبلغین، لٹریچر اور اجلاس کے توسط سے پہنچائی جاتی ہے۔ مسلمانوں

میں اصلاح اعمال، صالح معاشرہ کے قیام اور غلط رسومات کو مٹانے کے لئے نمایاں خدمات انجام دیئے جاتے ہیں۔ ارشد القادری نے اس شعبہ کو تابناک کرنے اور ادارۂ شرعیہ کے دینی وملی پیغام کو مسلمانوں کے گھروں تک پہنچانے کے لئے کئی اہم اور تاریخی دورے واجلاس کئے جن میں 06 مارچ، 1981 کو دھنباد میں تعلیمی کانفرنس، 24,25 مارچ، 1984 کو ڈالٹین گنج میں 'اسلامی کانفرنس' اور 1994 میں بہار کے 29 مقامات پر تحریک بیداری اور اصلاح معاشرہ کے لئے ''ادارۂ شرعیہ کانفرنس'' شامل ہیں۔ مختلف مقامات پر منعقدہ آخر الذکر کانفرنسوں کی صدارت ارشد القادری نے فرمائی تھی۔ ارشد القادری نے ان کانفرنسوں میں جن عناوین کی طرف خطوط کھینچے تھے وہ ارشد القادری کی قوت ارادی، عمل پیہم اور آفاقی حلم وتدبر کے ترجمان تھے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(1) آج کے دور میں اپنے دین وایمان، علم وتہذیب اور اپنے شہری حقوق کی حفاظت ہم کس طرح کریں۔

(2) اسلام دشمن طاقتوں کی زد سے ہم اپنی اسلامی شریعت اور اپنی مقدس مسجدوں کو کس طرح بچائیں۔

(3) شادی بیاہ، نکاح وطلاق اور تربیت اولاد کے سلسلے میں اسلام کی صحیح تعلیمات کیا ہیں۔

(4) نمازیوں سے مسجدوں کو بھر دینا صرف عبادت ہی نہیں ہمارے بہت سارے مسائل کا حل بھی ہے۔

(5) ملت کے نوجوانوں کو وقت کی سب سے بڑی طاقت میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

(6) اور اس ملک میں اپنی آواز کا وزن محسوس کرانے کے لئے مسلم اقلیت کی بکھری ہوئی قوتوں کو کس طرح منظم کیا جائے۔

(7) ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے پرہیز کیجئے یہ خاندان کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

(8) وہی نوجوان قوم کی آنکھ کا تارا ہے جس کے دامن پر اخلاقی رذالت کا کوئی دھبہ نہیں ہے۔

(9) منصب رسالت کا احترام اسلام کے ایوان کا سنگ بنیاد ہے۔

(10) عشق رسول ہی امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو متحدہ کر سکتا ہے۔

(11) اس ملک کا باعزت شہری بننے کے لئے اتنا بہت کافی ہے کہ آپ ہر شعبۂ زندگی میں ایک سچے مسلمان بنیں۔

(12) اولیاء کرام کی عقیدت روشن ماضی کے ساتھ ہمارا رشتہ جوڑتی ہے۔

(13) صرف تعلیم ہی راستے کی ساری رکاوٹوں کو دور کر کے اقتدار کی کرسی تک پہنچاتی ہے۔

(14) کسی بھی جمہوری ملک میں شہری حقوق حاصل کرنے کے لئے تنظیم واتحاد کی طاقت سب سے بڑی ہے۔

(15) شادی کے لئے جہیز کا مطالبہ غیر مسلم تہذیب کی علامت ہے۔

اس کے علاوہ شعبۂ تبلیغ کے تحت 1970 سے اب تک بہت سارے چھوٹے بڑے اجلاس سمپوزیم، سمینار، مباحثہ و مذاکرہ کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح ادارۂ شرعیہ بہار نے ''رشتۂ نکاح بلا مطالبہ جہیز'' کے نام سے ایک ازدواجی مرکز قائم کر کے تاریخی اصلاحانہ کام کیا ہے، ارشد القادری جو ہمیشہ قوم مسلم کی ابتری و بے بسی پر متفکر رہتے تھے انھوں نے مختلف مقامات پر اصلاح معاشرہ کانفرنسوں کا انعقاد کر کے تحریک بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی اور جملہ مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کی غیرت کو للکارتے ہوئے خطوط کھینچ کر پیغام دیا تھا۔''(20)

(5) **شعبہ تنظیم و ملی**—اس شعبہ کا مقصد مسلمانوں کو منظم و مستحکم کر کے انصاف و حق کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے اپنی آواز کو طاقتور بنانے، اسلامی تشخص کے ساتھ ہند میں مقیم دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ صلح و آشتی قائم کرنا اور تحفظ مدارس و مساجد، خانقاہ، اوقاف، مسلم پرسنل لاء اور مسلمانوں کو درپیش سلگتے مسائل کے لئے جدو جہد کرنا ہے اس شعبے کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے ارشد القادری نے اپنی تحریکوں کے توسط سے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے دورے بھی کئے۔ اتحادی قوت و افادیت کو تحریر و تقریر سے روشناس کرایا۔ مسلم مسائل کے حل کے لئے سربراہان اقتدار سے ملاقاتیں کیں، میمورنڈم پیش کئے اور تاریخی کانفرنسوں نمائندہ، اجلاس کا انعقاد کر کے ملی مسائل کو بڑے شد و مد کے ساتھ حکومت وقت کے سامنے رکھا۔ 14,15 اپریل، 1982 کو سیتامڑھی میں تعمیر ملت کانفرنس صوبہ بہار کے علاوہ اس شعبے کے زیر اہتمام اڑیسہ، بنگال اور آسام کے بیشتر علاقوں میں وہاں کے مسلمانوں کے درپیش ملی مسائل کے متعلق سے نمائندہ اجلاس منعقد کئے اور بہار کے ضلع سیوان، چھپرہ اور گوپال گنج سطح پر اپنے آئینی حقوق کے باریابی کے تئیں خوابیدہ قوموں کو بیدار کرنے کے لئے 1985 کو سیوان میں ''مسلم اقلیت'' بنام اسلامی کانفرنس کا انعقاد فرمایا۔ یہ کانفرنس دو اجلاس پر مشتمل تھی دن میں سیاسی اور رات میں مذہبی۔ سیاسی اجلاس میں اس وقت کے مرکز اور صوبہ کے مختلف وزراء ملک کے سیاسی عمائدین مدعو کئے گئے تھے۔ کانفرنس کو تاریخ ساز بنانے کے لئے مذکورہ تینوں اضلاع پر مشتمل کمیٹیوں اور مجلس استقبالیہ کی تشکیل ہوئی تھی، جس کا صدر دفتر دارالعلوم معینیہ حیدر نیا قلعہ سیوان کو بنایا تھا اور تینوں اضلاع میں پھیلے ہوئے اہلسنت کے ساتھ مدارس کے اراکین، اساتذہ اور ہزاروں طلبہ نے ارشد القادری اور ذمہ داران ادارۂ شرعیہ کا بھرپور تعاون فرما کر کانفرنس کو کامیاب کیا تھا۔

ارشد القادری کے سینے میں ملت کا کس قدر درد اور اخلاص تھا جس کا اندازہ 15 نومبر، 1981 کو ادارۂ

شرعیہ بہار کا ترجمان پندرہ روزہ ''رفاقت'' کے جشن اجراء جس میں اس وقت بہار کے گورنر عزت مآب جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی اور وزیر اعلیٰ بہار جناب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے، میں انھوں نے خطبۂ استقبالیہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ ''ادارۂ شرعیہ بہار جس کی تقریب میں آپ حضرات شریک ہو کر ہمیں ممنون فرما رہے ہیں۔ اس کی بنیاد 1968 میں ریاست کے تین لاکھ مسلمانوں نے سیوان کی ایک کانفرنس کے موقع پر رکھی تھی۔ بارہ سال کی مدت میں ادارۂ شرعیہ، بہار نے اپنے مذہبی، تعلیمی اور سماجی خدمات کے ساتھ ساتھ ملک کی سالمیت استحکام و ترقی اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

ارشد القادری آگے یوں گورنر اور وزیر اعلیٰ کو مخاطب ہو کر بے باکی کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں:

''اب رہ گیا اس ملک میں اقلیت کا کردار تو اس کے متعلق ساری دنیا جانتی ہے کہ اچھے دن ہوں یا برے ہر حال اور ہر موسم میں ہماری وفاداری اور حب الوطنی نکھرے ہوئے سونے کی طرح بے داغ رہی ہے۔ نہ ہم کبھی حکومتوں کے لئے دردسر بنے اور نہ ملک کے خلاف غداری کا چھوٹا سے چھوٹا واقعہ بھی کوئی ہماری طرف کر سکا اسی ملک میں لوگ اپنے حقوق کے لئے قیامت ڈھاتے رہے لیکن ہمارا صبر و استعناد دیکھئے کہ ہم نے اپنے لئے کبھی شاہ راہوں پر کوئی خاموش مظاہرہ تک نہیں کیا بارہا درد و کرب کی منزلوں سے گزرے اور گزرتے رہے لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم جذبات کے تلاطم میں کبھی بے قابو ہو گئے ہوں۔''(21)

یہ ہے ارشد القادری کے خطبہ کا ایک حصہ جو اردو ادب اور دینی و ملی جذبہ کا شاہکار ہے۔

(6) **ریلیف مشن**— ادارۂ شرعیہ کا یہ شعبہ مصیبت زدہ مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد و خدمات سے تعلق رکھتا ہے اس شعبہ کے ذریعہ فسادات اور ناگہانی حوادث کے موقع پر راحت رسانی بازآبادکاری، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کی جاتی ہے۔ چنانچہ اڑیسہ میں قیامت خیز طوفان اور گجرات زلزلہ سے متاثرین کی امداد، بھاگلپور، سہسرام، سیتا مڑھی اور گجرات میں موجودہ ریاستی سرکار کے ایما پر منصوبہ بند مسلم کش فساد زدہ علاقوں میں ادارۂ شرعیہ کے ریلیف مشن نے لٹے پٹے مسلمانوں یتیموں اور بیواؤں کی راحت رسانی اور آبادکاری کا کام جس دیانت داری اور جاں فشانی کے ساتھ کیا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ادارہ کا ریلیف مشن اپنے جماعتی اثر و رسوخ کے ذریعے ان مسائل میں بھی مسلمانوں کی مدد کرتا ہے، جن کا تعلق حکومت سے ہے نیز ناگفتہ بہ حالات میں ماحول کو سازگار کرنے میں پولس انتظامیہ کو تعاون کیا

جاتا ہے۔

(7) **مرکز تربیت افتاء**—اس شعبے کے ذریعہ تقابلی امتحان میں کامیاب ہونے والے علماء کرام کو افتاء کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ فقہ حنفی کی روشنی میں نت نئے پیش آنے والے احکام کا استخراج کر کے امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں اس کے لئے ان حضرات کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کی سہولتوں کے علاوہ ماہانہ وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔

(8) **جمعیۃ ائمہ مساجد**— یہ شعبہ ملک کی مسجدوں کے لئے ایسے افراد تیار کرتا ہے جو امامت کے صحیح فرائض انجام دے سکیں اور جہاں بھی رہیں ماحول کو اچھے عقیدہ اور کردار کے سانچے میں ڈھال سکیں، اس شعبہ سے تیار کردہ افراد کی تعداد ہزاروں میں ہے جو ملک کے طول وعرض میں منصب امامت پر فائز ہیں۔

(9) **شعبہ نشر و اشاعت**— یہ شعبہ پوسٹر، ہینڈ بل، تصنیف و تالیف، کتابچے، رسالوں اور دیگر مطبوعات کے ذریعہ پورے ملک میں عوام کی فکری اور عملی اصلاحات کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اسی شعبہ سے ادارۂ شرعیہ کا ترجمان پندرہ روزہ ''رفاقت'' 1981 میں شائع ہوا جسے بعد میں ماہنامہ کر دیا گیا جس میں ہر محاذ پر مسلمانوں کی صحیح ترجمانی کی۔ ارشد القادری نے اپنے ادارتی صحافت کے توسط سے مسلمانوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا۔ پورے ملک میں رفاقت کے اجراء کا خیر مقدم کیا گیا اور بحسن و خوبی اکتوبر 1989 تک جاری رہا۔ مگر بعد ہ نا ساعد حالت کے سبب اس کی اشاعت بند ہو گئی جسے دوبارہ ارشد القادری خصوصی شمارہ سے شائع کرنے کا اعلان ارشد القادری کے ایصال ثواب کے لئے منعقدہ 2 مئی 2002 بمقام مکہ مسجد دھنکیڈیہہ، جمشید پور کے اجلاس میں ادارۂ شرعیہ بہار کے مہتمم مولانا غلام رسول بلیاوی نے کیا۔ ادارۂ شرعیہ کا شعبہ نشرو اشاعت، دینی، ملی ملکی اور سیاسی معاملات میں گہری نظر رکھتا ہے حسب ضرورت ذرائع ابلاغ کے توسط سے عوام وملت کی رہنمائی کے لئے پیغام بہم پہنچاتا رہتا ہے۔

(10) **کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر**—اس شعبہ کے ذریعہ غریب و نادار افراد کے بچوں کو عصری تعلیم سے آراستہ کر کے انھیں معاشی طور پر خود کفیل بنایا جاتا ہے تاکہ مستقبل میں وہ اپنی معاشی بدحالی پر قابو پا کر ایک خوشحال مسلم معاشرہ کے فرد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں۔

(11) **یتیم خانہ**— اس شعبہ کے توسط سے غریب و نادار اور یتیموں کی رہائش خوراک اور لباس کے ساتھ دینی و دنیاوی تعلیم کی سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے، اب تک شعبہ یتیم خانہ سے سینکڑوں یتیم بچے تکمیل حفظ کے بعد خدمت دین میں مامور ہیں۔

(12) **ارزاں رضا لائبریری**—لائبریری کا مقصد مدرسہ شرعیہ اور یتیم خانہ کے طلبہ کے اندر لکھنے پڑھنے کا شوق

پیدا کرنا اور اسلامی و ادبی تاریخ کے معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ لائبریری میں اس وقت اسلامی، ادبی، تاریخی اور اصلاحی عناوین پر مشتمل پانچ ہزار سے زائد کتابیں ہیں جن سے طلبہ فرصت کے اوقات میں استفادہ کرتے ہیں۔

ادارۂ شرعیہ کا دائرہ کار پہلے صرف صوبۂ بہار تک محدود تھا مگر اب ملک کے مختلف صوبوں میں پھیل چکا ہے جو اس کا اصل مقصد بھی ہے جیسا کہ ادارہ کے اغراض و مقاصد کے مقصد اول سے ظاہر ہے کہ ملکی سطح پر مسلمانوں کو متحد و منظم کرنا۔ اس کے دائرہ کار کے انجام دہی کے لئے تین نوعیت کی مجلسیں تشکیل دی گئی ہیں۔ (1) مجلس منتظمہ (2) مجلس شوریٰ (3) اور مینیجنگ ٹرسٹی۔

ادارۂ شرعیہ نے اس طویل مدت میں جو خدمات انجام دیں ہیں ان کی لمبی فہرست ہے اور قوم وملت کے سماجی زندگی پر اس کے بہت ہی دور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ وہ عظیم الشان مذہبی و ملی قلعہ ہے جو پورے ملک کے مسلمانوں کے دکھ درد میں محسن کی حیثیت سے ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔

ارشد القادری اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء

ارشد القادری نے ہندوستان کی راجدھانی دلّی میں ایک ایسا دینی و دعوتی مرکز قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا جو اپنی نوعیت کا بالکل منفرد ادارہ ہو، اس ادارے میں دعوت وتبلیغ کی جدید تکنیک اور بین الاقوامی زبانوں کو دو سالہ کورس کے ذریعے مدارس اسلامیہ کے ان طلبہ کو پڑھایا جائے جو وہاں سے باقاعدہ فارغ ہو چکے ہوں۔ اس ادارے کے قیام کے سلسلے میں زمین کی حصولیابی کے لیے وہ حکومتی سطح پر 1980 سے ہی جدو جہد کرتے رہے، مگر انھیں کامیابی نہ مل سکی، بالآخر برسوں کی سعی لا حاصل کے بعد ارشد القادری نے 1992 میں فیصلہ کیا کہ اب کوئی زمین خرید کر ہی اپنا کوئی ادارہ بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔25 میں زمین خرید کر 06 جون، 1992 میں اس کا جلسۂ سنگ بنیاد منعقد کیا اور چند ماہ بعد اسی زمین پر ایک نقشے کے مطابق چار منزلہ عمارت کی تعمیر شروع کرا دی جو 1994 میں مکمل ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ہی اس میں ارشد القادری نے تعلیم و تدریس کا بھی انتظام کیا اور باضابطہ تدریسی آغاز ہو گیا جو آج جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کی شکل میں موجود ہے۔ ارشد القادری اس ادارہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''میری عمر کا بڑا حصہ یورپ اور مغربی ممالک کی خاک چھاننے میں گزری، میں نے وہاں شدت سے محسوس کیا کہ ایسے علماء کی سخت ضرورت ہے، جو بین الاقوامی زبانوں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ بحسن خوبی انجام دے سکیں۔ یورپ میں چونکہ عربوں کی بھی معقول تعداد آباد ہے، اس لئے عربی کے ذریعہ بھی یورپ میں کام کرنے میں آسانی ہوگی لیکن یہ کام کسی روایتی مدرسہ میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے الگ سے ایک تربیتی مرکز قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسا ادارہ ضرور قائم کروں گا، جہاں قدیم نظام تعلیم و تربیت کے پروردہ علماء کو جدید علوم وفنون سے مسلح کرنے کا کام کیا جا سکے۔'' (22)

شعبہ تخصص ادب و دعوت ہی جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کا بنیادی اور مرکزی شعبہ ہے، جس کی وجہ سے اس جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔

ارشد القادری جامعہ کے تعارفی رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''آج سب سے بڑا مسئلہ قابل افراد کی تیاری کا ہے، امت کی قیادت کا کام سب سے مشکل ترین کام ہے، اس لیے زبان دانی، وسیع علم اور صحیح فکر کے ساتھ اعلیٰ کردار کی ضرورت ہے۔ اہل سنت کے نوجوان علما کو جب تک ان سارے وسائل سے مسلح نہیں کیا جائے گا آفاق کی وسعتوں میں اپنے لیے جگہ نہیں بنا سکیں گے۔'' (23)

طریقۂ تعلیم

ذریعہ تعلیم کے طور پر جامعہ میں دو زبانوں کا عموماً استعمال کیا جاتا ہے عربی مضامین عربی میں اور انگریزی مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ حسب ضرورت افہام وتفہیم کے لیے اردو زبان کا بھی سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کے لیے اکثر طلبہ کو مکالمہ ومباحثہ کے ذریعہ راہ نمائی کی جاتی ہے۔ طلبہ کی مزید تربیت اور ذہنی نشو ونما کے لیے ثقافتی انجمنیں (Cultural organisations) قائم کی گئی ہیں، جو حسب ضابطہ کام کرتی ہیں ان کا اہتمام و انتظام طلبہ کے ہی ذریعہ ہوتا ہے۔ ان انجمنوں کے ذریعہ طلبہ کو ذہنی، عقلی، فکری وثقافتی اعتبار سے طاقتور اور ناقابل تسخیر بنایا جاتا ہے تاکہ وہ کسی بھی صورت حال کا با آسانی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جدید محاورات وضرب المثال، تعبیرات جدید اور مفید جملوں کی تکرار وحفظ کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ذخیرہ الفاظ کے بغیر کسی بھی زبان پر قدرت حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جدید انگریزی وعربی اخبارات ورسائل کی مدد سے جدید تعبیرات اور مفید جملوں کو نوٹ کر ایا جاتا ہے اور ان کو یاد کرا کر سنایا جاتا ہے۔ نیز عملی طور پر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کا خاص طور پر کام لیا جاتا ہے۔

مثلاً اردو انگریزی، انگریزی اردو، عربی اردو، اردو عربی، انگریزی عربی اور عربی انگریزی ترجموں کے ذریعہ لفظوں کے تبادلے کا ایک متوازن نظام قائم ہے۔ جس کی وجہ سے ان تینوں زبانوں میں بیک وقت تقریری وتحریری صلاحیتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

جامعہ سے متعلق اپنے ایک مضمون میں مولانا محمد مہتاب عالم تحریر فرماتے ہیں:

> ''جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء جس میں مختلف مدارس کے فارغ التحصیل نوجوان فضلا کو داخلہ دیا جاتا ہے، اور خاص طور سے عربی اور انگریزی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے لیے دو سالہ تخصص فی الادب والدعوہ کورس کا مکمل انتظام ہے یہاں زیر تعلیم طلبہ کے لیے بہترین طعام وقیام اور ماڈرن سہولیات کا اچھا انتظام ہے۔ جو طلبہ کے دل ودماغ کو تازگی اور توانائی فراہم کرنے میں بلند و بالا اور روشن خیال فکر وعمل میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں، ساتھ ہی طلبہ کی زبان و بیان اور تحریر و تقریر میں دلکشی اور نیا پن پیدا کرنے کے لیے کئی ایک انگریزی عربی اور اردو کی انجمنیں اور مسابقتی بزم منعقد کی جاتی ہیں اور دعوت وتبلیغ کے طریقۂ کار سے آگاہ کیا جاتا ہے۔''(24)

جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء آج ہندوستان میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ بن گیا ہے جہاں مدارس اسلامیہ سے فارغ علماء وفضلاء کو ترقی یافتہ زبان عربی وانگریزی سے آراستہ کر کے دنیا کے گوشے گوشے میں مذہب اسلام کی

ترویج واشاعت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔اس ادارے کی سند کا معادلہ عالم اسلام کی قدیم ممتاز دینی دانش گاہ جامعہ ازہر، مصر سے بھی ہے یہاں سے فارغ التحصیل جامعہ ازہر، مصر میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے عالمی پیمانے پر اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔اس وقت جامعہ نظام الدین اولیاء سے بھیجے گئے تقریباً تیس طلبہ جامعہ ازہر، مصر کے مختلف شعبوں میں زیر تعلیم ہیں اور طلبہ کی اتنی ہی تعداد وہاں سے تعلیم حاصل کر کے ہندوستان اور دنیا کے مختلف ممالک میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔

اس جامعہ کا قیام صرف شعبہ تخصص کے لیے عمل میں آیا تھا۔مگر بعد میں باشندگان دہلی کے پیہم اصرار پر ارشد القادری نے یہاں شعبۂ حفظ وقرأت کا بھی انتظام کر دیا تھا۔جس میں مقامی طلبہ کے علاوہ کچھ بیرونی طلبہ بھی ہیں۔

صحافتی سرگرمیاں:

صحافت معاشرے کی بہتر تربیت کرتی ہے۔ معاشرے کی مختلف اقدار کے تحفظ میں معاون بھی ہوتی ہے اورعوامی رجحانات کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ جو کچھ دنیا بھر میں ہو رہا ہے اگر وہ لوگوں کی دل چسپی جانکاری اور جوش پیدا کرنے کے لائق ہے تو اسے لوگوں تک پہنچایا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صحافی کا یہ فرض بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حادثے کی اصل وجہ کیا تھی۔ حادثہ کس طرح اور کیوں ہوا، مستقبل میں اس کا کیا اثر ہوگا جیسے سوالوں پر بھی قارئین کو معلومات فراہم کرائے۔

ادبی تحریروں میں ادیب کی ذاتی فکر بنیاد ہوتی ہے۔مزید یہ کہ صحافتی تحریروں کی زندگی مختصر ہوتی ہے لیکن ادبی تخلیقات ایک لمبے عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں اور آنے والی متعدد نسلیں ان سے استفادہ کر سکتی ہیں۔صحافت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ معاشرے کو اس بات کی معلومات بھی فراہم کرائے کہ اس معاشرے کے لوگ کیا کر رہے ہیں کیا محسوس کر رہے ہیں اور ان کے رجحانات وافکار کی سمت ورفتار کیا ہے۔

ارشد القادری نے اپنی صحافتی زندگی کی شروعات جام کوثر (پندرہ روزہ) کلکتہ سے کی اس کے بعد انھوں نے ماہنامہ جام نور کلکتہ کی اشاعت شروع کی۔ پٹنہ سے انھوں نے دو رسالے شائع کیے۔شان ملت (پندرہ روزہ) اور ماہنامہ رفاقت۔ ارشد القادری نے تصنیف وتالیف کے ساتھ صحافت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا۔آپ کا صحافتی شعور بہت پختہ تھا۔ایک کہنہ مشق اور ذمہ دار صحافی کی حیثیت سے ایک عرصے تک ''جام کوثر'' ایڈٹ کرتے رہے۔

ارشد القادری نے فکر اسلامی کو تازہ دم رکھنے کے لیے فروری 1967 میں ''جام کوثر'' جاری فرمایا۔آپ نے فکر اسلامی کو عام کرنے میں اپنے مصروف ترین قیمتی لمحات کی قربانی دی مسلمانوں کے ذہنوں کی تعمیر کے لیے آپ نے

مستقل قلم کا استعمال کیا۔

جام نور مارچ، 1967 کے اداریہ میں خود کو صحافتی زندگی سے وابستہ کرنے کے عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں:

''جس ضرورت کے احساس نے میری زندگی کو صحافتی دور میں داخل کیا ہے اس کے متعلق ذیل کی چند سطریں غور سے پڑھیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں ہر جگہ اہل سنت والجماعت کی عظیم اکثریت ہے، اس کا اندازہ ان مذہبی اور روحانی تقریبات سے ہوتا ہے جو یکساں طور پر ہندوستان کے سارے طول وعرض میں منائی جاتی ہیں، جب کہ اہل سنت کے علاوہ کوئی فرقہ انھیں اپنی مذہبی تقریب قرار نہیں دیتا۔ لیکن ہم تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے اثر کے لحاظ سے قطعاً اقلیت میں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب تک ہم اپنے قرار واقعی وجود کا یقین ہی نہیں دلا سکے ہیں۔ دنیا کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے یہاں تین چار متوازی جماعتوں کی تنظیم ہے پھر بھی ہم منظم نہیں ہیں۔ ہر جماعت کی ناکامی کے بعد ایک نئی جماعت اس امید کے ساتھ وجود میں لائی گئی کہ شاید اس کے ذریعہ ہمارا خواب شرمندۂ تکمیل ہو جائے، لیکن وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اپنے پیشروؤں سے جا ملی۔ اس خطرناک اور نتائج آزمودہ اقدام کے لیے میں ہرگز رائے نہیں دوں گا کہ اپنے جماعتی مسائل سے نپٹنے کے لیے اب کوئی پانچویں جماعت بنائی جائے آج کی صحبت میں صرف اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے یہاں کچھ ایسی چیزوں کا ضرور فقدان ہے جو کسی بھی جماعتی تنظیم کے لیے ناگزیر ہیں مثال کے طور پر ہم ملک میں ذہنی اعتبار سے کارکنوں کا کوئی دستہ تیار کیے بغیر کل ہند سطح پر اپنی جماعتوں کے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف مذہبی اعتقاد کی یکجہتی کسی بھی دستوری جماعت کا بوجھ اٹھانے کے لیے کافی ہے حالانکہ مذہبی خیالات کی یگانگت اور کسی تنظیمی جماعت کے اغراض سے اتفاق، دونوں میں نہایت واضح فرق ہے۔ کسی بھی جماعتی تنظیم کو بروے کار لانے کے لیے جب تک افراد کے درمیان نظام جماعت کے ساتھ ذہنی ارتباط، جذباتی لگن والہانہ آمادگی باطنی اخلاص اور قربانیوں کی سچی تڑپ موجود نہ ہو عوامی سطح پر کسی مضبوط قیادت کی نمود اور بکھرے ہوئے شیرازوں کی یکجائی ناممکن ہے۔ جب تک ہم دلنشیں اور پرکشش لٹریچر کے ذریعہ سنی نوجوانوں کا ذہنی، جماعتی مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیتے ہماری کوئی تنظیم قابل ذکر کردار کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ صحیح العقیدہ حلقوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی تو انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ہم ایک بے داغ اور نکھرا ہوا لٹریچر جماعت کے حوالہ کریں گے۔''(25)

ارشد القادری نے اس ضرورت کو بخوبی محسوس کیا ورحتی الامکان وہ اس کی تکمیل میں سرگرداں بھی رہے۔ ایک سال کے بعد بھی جب جماعت کے حساس و ذمہ دار لوگ خواب غفلت سے باہر نہ آ سکے تو ان کی تڑپ شدید سے شدید ہوتی چلی گئی تب جام نور فروری، 1969 کے اداریہ میں عوام وخواص اہل سنت سے وہ کھل کر گفتگو کرتے ہیں۔ ارشد القادری پریس کی اہمیت وافادیت پر غور وفکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''جی چاہتا ہے کہ آج کھل کر اہل سنت کے عوام وخواص کو اپنے درد وکرب کا نالۂ شب گیر سناؤں آنکھوں کی نیند اگر اڑ جائے تو مجھے معذور رکھیں گے۔ یوں بھی چوٹ کھائے ہوئے انسان سے درد کی بیتابی کے سوا اور کسی بات کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ ایک عرصہ سے چیخ رہا ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو سوچنے اور برتنے کا انداز بدلنا ہوگا۔ فولاد کی تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا اب قلم کی تلوار سے معرکہ سر کیے جا رہے ہیں۔ پہلے کسی محدود رقبے میں کفر وضلالت کی اشاعت کے لیے سالہا سال کی مدت درکار ہوتی تھی اور اب پریس کی بدولت صرف گھنٹوں میں شقاوتوں کا ایک عالمگیر سیلاب امنڈ سکتا ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیے! آج ہندوستان کا ہر فرد قلم کی توانائی اور پریس کے وسائل سے کتنا مسلح ہو چکا ہے۔ اتنا مسلح کہ اس کی یلغار سے ہمارے دین کی سلامتی خطرے سے دو چار ہوتی جارہی ہے۔ بلکہ میں بعض ایسی بھی جماعتوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جن کے وجود کا کوئی سر رشتہ ماضی میں نہیں ملتا لیکن اس اجنبیت کے باوجود صرف قلم کے وسائل کے بل پر وہ روئے زمین پر طوفانوں کی طرح پھیلتی جارہی ہیں اور ان کا اجنبی لٹریچر سینکڑوں برس کی قابل اعتماد تصنیفات کو نہایت تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ فکری استحکام کے بغیر کوئی جماعت بھی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پریس ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ فتنہ صبح کو جنم لیتا ہے دوپہر تک جوان ہو جاتا ہے اور شام ہوتے ہوتے آبادیوں کے لیے ایک دردناک آزار بن جاتا ہے۔ ان حالت میں جبکہ باطل پرستوں کی یلغار تیز تر ہوتی جارہی ہے ہم خفتگان شب غفلت کی نیند اور گہری ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے یہاں نکتہ چینی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ البتہ تعمیری ذہن رکھنے والے افراد بہت کم ہیں۔ اجتماعی محاذوں پر جو لوگ کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے کہ کتنی کٹھنائیوں سے انھیں گزرنا پڑتا ہے۔'' (26)

جب جامِ نور پر حکومت کا عتاب نازل ہوا تو ارشد القادری جرأت و بیباکی کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں وہ جام نور دسمبر، 1968 کے اداریہ میں تحریر کرتے ہیں:

''اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ قائین کو یہ خبر معلوم ہوگئی ہوگی کہ جام نور جیسا خالص مذہبی اور علمی رسالہ بھی حکومت کے عتاب کی زد میں آ گیا ہے۔ ستم بالائے ستم کی مثال اس سے زیادہ اور کہاں مل سکتی ہے کہ ہمیں

لوٹا جائے، جلایا جائے، مارا جائے اور رونے بھی نہ دیا جائے اس سیکولر اسٹیٹ میں ہر شخص کو زبان وقلم کی آزادی حاصل ہے۔ آگ برسانے والے شب و روز آگ برسا رہے ہیں۔ ان سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ صرف غریب مسلمان کی فریاد سے آنکھوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔'' (27)

ارشد القادری نے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے حالات کو اپنے موافق بنانے کی دھن میں تاحیات سرگرداں رہے۔ ارشد القادری کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہمیں جام نور کے اداریے سے ہوتا ہے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔ جو ارشد القادری کے سیاسی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ جام نور اپریل، 1968 کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

''اب حالات کی سنگینی نے مسلمانان ہند کو اس نازک مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جہاں وہ مایوسی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ جان و مال کی تباہی اگر اتفاقی حادثوں کی طرح پیش آنے والی کوئی بات ہوتی تو اپنے دل کو سمجھایا جا سکتا تھا لیکن اب یہ شہری درندوں کے لیے شب و روز کا معمول بن چکا ہے۔ نہ اب کسی طبقے کی تخصیص ہے نہ کسی خطے کا استثنا سارا ہندوستان بلا تفریق لرزہ خیز مظالم کا خوگر بنتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف حکومتوں کی شرمناک بے بسی کا عالم یہ ہے کہ ملک کی سرحدوں پر دشمنوں کی صفیں الٹنے کے لیے اس کے پاس فوج اور اسلحے کی قوت سب کچھ موجود ہے لیکن آبادیوں کے اندر امن وسلامتی کے غارت گروں کا رخ پھیرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہے کہ بسا اوقات حکومت کے پولس خود بلوائیوں کے لیے دیوار پناہ بن جاتی ہے۔ چوروں سے تو نپٹا جا سکتا ہے لیکن پاسبانوں سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔ مسلمانوں کو بلوائی بھی پٹتے ہیں اور پولس بھی اپنی سنگینیوں کا نشانہ بناتی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اپنی تاریخ کی معنوی قوتوں پر اعتماد کر کے انتہائی پامردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔'' (28)

ارشد القادری نے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے اور دوسرے مسلم مسائل کے تحت 10,11,12 مئی، 1968 کو سیوان کی سرزمین پر صوبائی سنی کانفرنس کا اعلان کر دیا جس میں تین لاکھ سنی مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہوا۔ ارشد القادری لکھتے ہیں:

''پیہم فسادات اور خون رستے ہوئے زخموں نے ہماری زندگی کو جن بیتابیوں سے معمور کر دیا ہے وہ وقت کا سب سے بڑا ماتم ہے۔ اب ہمیں پوری جرأت انداز کے ساتھ حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو لفظوں میں اپنے مستقبل کا آخری فیصلہ لینا ہے۔ خوف و مایوسی کے اس ویرانے میں صوبۂ

بہار نے سیوان کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کر کے امیدوں کا ایک چراغ جلایا ہے۔'' (29)

ارشد القادری رانچی، سرینگر، شولا پور، مالیگاؤں، احمد نگر، پونا، لہریا سرائے، ہزاری باغ اور سیتامڑھی کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد جام نور نومبر، 1967 کے اداریے میں حکومت کی نا اہلی کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس برصغیر ہند میں مسلمانوں کا مستقبل دن بدن جتنا، مشکوک اور مایوس کن ہوتا جا رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ایک ثابت شدہ حقیقت کی طرح اب یہ بات بحث و دلیل کے مرحلے سے بہت آگے نکل چکی ہے کہ مسلمانوں کی ہر شام و سحر کسی بھی اچانک ٹوٹ پڑنے والے خطرے کے نشانے پر ہے۔ جو لوگ اس ملک کا نظام حکومت چلا رہے ہیں یا تو دیدہ و دانستہ وہ مسلمانوں کے مسائل سے چشم پوشی کرتے ہیں یا پھر تھک ہار کر ظلم و فساد کی طغیانیوں کے آگے انھوں نے سپر ڈال دیا ہے، دونوں حالتوں میں سے کوئی حالت بھی ہو، نا اہلیت، سنگدلی اور فرض ناشناسی کی انتہائی بدترین مثال ہے۔'' (30)

اس سلسلے کا دوسرا اقتباس ہے:

'' کہتے ہیں کہ ہندوستان پر ایک غیر مذہبی دستور کی حکومت ہے جو یہاں کے شہریوں کی جان و مال، عزت و ناموس اور مذہب و ملت کے تحفظ کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ لیکن محکمۂ پولس جس کے ہاتھ میں براہ راست حکومت کی ایجنسی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ فساد کے موقعہ پر وہ بھی اپنے آپ کو غیر جانبدار نہیں رکھ پاتا۔ پولس کی سنگینیوں کے سائے میں جب غارت گروں کا مسلح ہجوم پوری آزادی کے ساتھ امن و قانون کی دھجیاں بکھیر چکتا ہے تو لاشوں کا انبار جمع کرنے کے لیے فوج طلب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد آگ اور خون کی سرزمین پر معزز فرماں رواؤں، وزیروں اور لیڈروں کے قافلے اترتے ہیں۔ جو ٹھنڈی آہوں مصنوعی ہمدردیوں اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مسلم آبادیوں کی خاکستری کا معائنہ فرماتے ہیں۔ مسجدوں اور مقبروں کے ٹوٹے ہوئے مینارے دیکھتے ہیں۔ کراہتے ہوئے زخمیوں، لٹے ہوئے پناہ گزینوں اور آشفتہ حال یتیموں، بیواؤں اور مقتولوں کے پس ماندگان کے سامنے اس طرح اپنے تاثرات کا اظہار فرماتے ہیں جیسے واپس لوٹتے ہی وہ قاتلوں سے ایک ایک قطرۂ خون کا انتقام لیں گے اور ان واقعات کے خلاف اتنا سنگین قدم اٹھائیں گے کہ پھر آئندہ اس طرح کے حادثوں کا اعادہ نہ ہو سکے گا لیکن آزادی کے بعد تقریباً سات سو فرقہ وارانہ فسادات میں کہیں بھی اس طرح کی مثال نہیں ملتی کہ حکومت کے سربراہوں نے پولس افسروں علاقائی انتظامیہ اور حکام ضلع کے

خلاف کوئی بھی سخت اور عبرتناک نوٹس لی ہو.....اپنے فرائض منصبی سے مجرمانہ چشم پوشی کرنے کی تعزیر میں انھیں معزول یا کم از کم معطل ہی کیا ہو.....اور بدامنی پھیلانے کے جرم میں قاتلوں اور بلوائیوں کو قرار واقعی سزا دی ہو۔ صرف پند و نصیحت اور بیانات سے اگر جرائم پیشہ راہ راست پر آجاتے تو تعزیرات ہند کے نام سے ایک مجموعۂ قوانین کی ہرگز ضرورت پیش نہ آتی۔ ہمیں کہنے دیا جائے کہ مبہم الفاظ میں فسادات کی مذمت اور مظلومین کے ساتھ زبانی ہمدردی کے علاوہ آج تک مسلمانوں کی جان و مال اور مذہب و ناموس کے تحفظ کے لیے کوئی آئینی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے اور یہ اتنی شرمناک اور سنگین فروگذاشت ہے جسے آنے والا مؤرخ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ طاقت کے بل پر اس سے بھی زیادہ لرزہ خیز مظالم ڈھائے جاسکتے ہیں لیکن طاقت کے بل پر تاریخ کا بے لاگ فیصلہ نہیں بدلا جا سکتا۔'' (31)

ارشد القادری نے ہندوستان میں مسلم قیادت کا ایک تنقیدی جائزہ جام نور فروری، 1968 کے اداریے میں پیش کیا ہے جو نام نہاد مسلم قیادت کی ہر محاذ پر ناکامی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، جمیعۃ العلماء، مسلم لیگ، ان کے اتحاد کے بطن سے جنم لینے والی تنظیم مجلس مشاورت ان میں ہر ایک مسلم مسائل کے حل میں ہر محاذ پر بری طرح ناکام رہی۔ مجلس مشاورت کی کارکردگی پر ارشد القادری تحریر کرتے ہیں:

''مجلس مشاورت کی سب سے شاندار خدمت یہ ہے کہ الیکشن کے موقع پر چھ کروڑ مسلم ووٹروں کی قیمت وصول کرنے کا جب سوال پیدا ہوا تو جہاندیدہ لیڈروں نے سوچا کہ کانگریس بدنام ہو چکی ہے کھل کر اس سے سودا کرنے میں پگڑی سلامت نہیں رہ سکے گی۔ اس لیے مارکیٹ میں نئے خریداروں کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر کانگریس کی حریف پارٹیوں سے معاملہ طے ہو گیا اور اس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سارے ہندوستان میں کانگریس کو ہرانے کی ایک طوفانی مہم شروع کی گئی۔ لیکن نشانے کی یہ خطا کبھی معاف نہیں کی جائے گی کہ'' کانگریس ہراؤ مہم'' کے پیٹ سے جن سنگھی اقتدار کا بچہ نکل آیا اور نکلتے ہی وہ جوان ہو گیا اور حکومت کی گدی پر قبضہ کر لیا، جو مسلم آزاد درندے خواب میں بھی وزارت کی بات نہیں سوچ سکتے تھے وہ مجلس مشاورت کی مہربانیوں سے وزارتی کابینہ پر مسلط ہو گیے۔ اب کفر کا جتنا حوصلہ بھی بلند ہو اور مسلمانوں کی پامالی کا جو نقشہ بھی ملک کے طول و عرض میں تیار کیا جائے کم ہے، سیاسی اقتصادی اور اجتماعی مسائل میں مجلس مشاورت کی قیادت نے ہمیں کیا دیا.....اضطراب مسلسل.....شکست پیہم.....لگاتار پامالی.....'' (32)

جام نور کو اس بلندی تک پہنچانے میں ارشد القادری نے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ یقیناً ان کی بے لوث اور مخلصانہ جدو جہد کا آئینہ ہیں۔ جام نور کے ذریعے ارشد القادری نے مسلم قوم کی رہبری کی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ حق کی آواز بلند کرتے رہے۔ آپ نے مسلمانوں کے سلگتے ہوئے مسائل کو ہی اپنا موضوع سخن بنایا۔ مردہ قلوب و اذہان میں اسلام کی حقیقی اسپرٹ پیدا کرنے میں اپنی تمام تر جدو جہد کو مصروف رکھا۔ مسلمانوں کے اندر اسلامی فکر بیدار کرنے کے لیے اپنی قلمی صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے مسائل جو کل تھے وہ آج بھی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ حکومت ہند کا سلوک آج بھی ویسا ہی ہے۔ ہر جگہ لٹے پٹے جا رہے ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ کل سے کہیں زیادہ ہمیں آج ارشد القادری جیسے بے باک اور نڈر صحافی کی ضرورت ہے، جو مسلمانوں کے مسائل کو بے باکی کے ساتھ حکومت ہند کے سامنے پیش کر سکے اور یہی ارشد القادری کی محنتوں کا ثمرہ ہوگا۔ ورنہ انسانی اقدار پامال ہوتے رہیں گے۔

جیل اور دیگر صعوبتیں

ارشد القادری نے جب جمشید پور میں سکونت اختیار کر لی اور ان کی سرپرستی میں مدرسہ فیض العلوم دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا تو ارشد القادری کے مخالفین کی نیندیں حرام ہونے لگیں۔ اس سے متعلق نوشاد عالم چشتی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''مدرسہ فیض العلوم کا جمشید پور میں قائم ہونے سے مخالفین اہلسنت کے علاوہ جن سنگھی ذہنیت کے متعصب ہندو بھی ارشد القادری کی مخالفت میں شروع سے ہی پیش پیش تھے۔ ارشد القادری کو زیر کرنے کے لیے ان تمام حریفوں نے اپنی رشیہ دوانیوں کا جال بچھا رکھا تھا، مخالفت کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔'' (33)

دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ملزم'' سے ''مجرم'' ہونے تک کا سفر بعض دفعہ انتہائی مختصر اور بعض دفعہ بڑا طویل ہوتا ہے۔ یوں ہی جیل کی در و دیواروں کو اپنا ہم راز و ہم نشین بنا لینے والے افراد اکثر و بیشتر خطرناک قسم کے ملک و سماج دشمن عناصر ہی ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی حکومت وقت کے ظالم صاحبان اقتدار بے بس و بے کس مظلوم و بے گناہ افراد کو بھی اپنی ہوس افکار کا نشانہ بناتے ہوئے جیل کی قد آدم آہنی چہار دیواری میں مقید کر کے تسکین دل کے لئے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تاریخ انسانیت میں نہ جانے کتنے ایسے بے گناہ اور مظلوم لوگوں کے نام سنہرے حروف میں لکھے ہوئے ہیں جن کا جرم صرف اتنا تھا کہ انھوں نے انسانیت کی بقا کے لیے شرافت کی تحفظ کے لیے حق کو حق اور باطل کو باطل کہا اور سمجھا۔ یوں بھی دارورسن، تختۂ دار اور زنداں سے ''علمائے حق'' اور ''قائدین ملت'' کا بڑا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ارشد القادری نے بھی زنداں کی مہمانی کر کے ایام اسیری کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا ہے۔ اور قید و بند کی ان تمام دلخراش صعوبتوں کو برداشت کیا جس کے تصور سے ہی انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ (34)

ارشد القادری کو تین مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی:۔

(1) پہلی بار 1964 (2 ماہ کے لیے) — ساکچی جیل، جمشید پور

(2) دوسری بار 1967 (9 ماہ کے لیے) — آرہ جیل، آرہ

(3) تیسری بار 1979 (6 ماہ کے لیے) — ساکچی جیل، جمشید پور۔

(اسی 6 ماہ کی مدت میں جیل کے اندر ارشد القادری نے اپنی مشہور کتاب زیر و زبر، تحریر فرمائی۔)

جن سنگھی اخبارات و رسائل نے ابتدا ہی سے ارشد القادری کے خلاف اپنی تحریرات میں بڑا سخت رویہ اپنایا تھا۔ ارشد القادری کے متعلق ایک ہندی روز نامہ ٹاٹا ایکسپریس کا متعصب نامہ نگار اپنے اداریہ میں لکھتا ہے۔ (ہندی سے اردو ترجمہ):

''مولانا ارشد القادری گرفتار (مذہبی قائد) گزشتہ ہفتہ بھارت کے تمام روز نامہ اخبارات میں ایک مذہبی قائد کی گرفتاری کی خبر شائع ہوئی اور ریڈیو سے (خبر) نشر ہونے کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گیے ہوں گے !وہ مذہبی قائد کوئی اور نہیں بلکہ ''شری قادری جی'' ہیں جنھیں ٹاٹا ایکسپریس نے بہت پہلے ہی ''قادری اور دنگا'' کے عنوان سے عوام کی عدالت میں پیش کر دیا تھا۔'' (روز نامہ ٹاٹا ایکسپریس، جمشید پور، شمارہ 9، ستمبر، 1979)''۔(35)

1961ء میں مدرسہ فیض العلوم جمشید پور کی عمارت بن کر تیار ہوئی۔ ارشد القادری کی یہ کامیابی شر پسندوں کے لیے ایک بڑی چیلنج تھی۔ ارشد القادری کو مارچ، 1964 میں ڈی۔آئی۔آر کے تحت ملت اسلامیہ کے قائد ہونے کی بنا پر گرفتار کرلیا گیا کیونکہ جمشید پور، 18 مارچ، 1964 کو بھیانک فرقہ وارانہ فساد سے بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ ارشد القادری دو ماہ تک جیل میں رہے لیکن بھاری عوامی دباؤ کے تحت آخر حکومت بہار کو مجبور ہو کر باعزت رہا کرنا پڑا۔ رہائی کے بعد ارشد القادری ایک بار پھر تعمیر وطن کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی آبادکاری اور خدمت خلق کو اپنا اولین مشن بنا لیا۔ اسی بیچ ایک بار پھر انھیں 1967 میں حکومت بہار نے ڈی۔آئی۔آر کے تحت گرفتار کر کے پہلے جمشید پور جیل میں رکھا اور پھر سیاسی مصلحت کی بنا پر ارشد القادری کو آرہ جیل میں منتقل کر دیا۔ ارشد القادری نے جیل میں 9 مہینے کا ایک طویل عرصہ گزار دیا۔

ارشد القادری کی تصنیفی، تبلیغی، اور جماعتی مصروفیات جاری و ساری تھیں کہ ایک بار پھر جمشید پور میں آگ و خون کی ہولی شر پسند عناصر نے کھیلنا شروع کر دیا۔ ارشد القادری اس فساد کے متعلق لکھتے ہیں:

''اپریل، 1979 میں جمشید پور کا وہ قیامت خیز سانحہ پیش آیا جس کی دھمک پوری دنیا میں محسوس کی گئی آگ اور خون کا طوفان تھم جانے کے بعد ہزاروں لٹے پٹے مظلوم مسلمانوں کی امداد و آبادکاری کا سوال کھڑا ہو گیا۔ کئی مہینے کے لیے فیض العلوم کی عمارتیں اور آس پاس کے میدان پناہ گزینوں کے کیمپ میں تبدیل ہو گیے۔ ابھی ہماری زندگی کا کھویا ہوا قرار بھی واپس نہیں ملا تھا اور اجڑے ہوئے لوگ اپنے گھروں میں اطمینان کی سانس بھی نہیں لے پائے تھے کہ فرقہ پرستوں کی سازش سے 28 اگست، 1979 کو دوبارہ فساد پھوٹ پڑا۔ اس بار بھی مدرسہ فیض العلوم کی عمارتوں اور آس پاس کے میدانوں

میں کئی ہزار پناہ گزینوں کی بھیڑ جمع ہوگئی اور بہت دنوں تک پھر ہمیں میزبانی کے فرائض انجام دینے پڑے۔'' (36)

ارشد القادری کے دشمنوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ارشد القادری نے فساد بھڑکانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ہندی اور انگریزی اخبارات نے ان کے خلاف پھر ایک بار صحافتی آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جانب دارانہ انداز میں اخبارات کی رپورٹنگ کی جیسے کہ ہندی روزنامہ' آریہ ورت' نے لکھا:

''جمشید پور کے دنگے کے پیچھے قادری گروہ کا ہاتھ، نئی دہلی، 5 ستمبر، بہار۔ شہر آہن جمشید پور میں ایک بار پھر گزشتہ 28 اگست کو جو فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھی اس کے متعلق مرکزی حکومت کے وزارات داخلہ، اپنی ذاتی تحقیقات کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس دنگے کے پیچھے اقلیتی طبے کے اس گروہ کا ہاتھ ہے جس کی قیادت مولانا ارشد القادری کرتے آئے ہیں۔' آریہ ورت' ہندی روزنامہ، 3 ستمبر، 1979۔'' (37)

ارشد القادری کے خلاف جن سنگھی غیر مسلم شر پسند عناصر اپنا پروپگینڈہ جاری رکھے ہوئے تھے حکومت کی نیت بھی ٹھیک نہیں تھی چنانچہ ارشد القادری کی گرفتاری کے لیے ایک بار پھر منصوبہ تیار کیا جانے لگا۔ اور 31 اگست، 1979 کو اچانک ارشد القادری کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کی تفصیل ارشد القادری زیر و زبر میں بیان کرتے ہیں، اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''31 اگست، کو مسٹر وائی۔ کے۔ چوہان وزیر داخلہ حکومت ہند، شری فضل الرحمٰن وزیر محنت، حکومت ہند جو نہایت متعصب قسم کے ہمارے مذہبی حریف بھی ہیں۔ جمشید پور آئے، فیض العلوم میں پناہ گزینوں کے کیمپ کا بھی انھوں نے معائنہ کیا۔ ان کی واپسی کے تھوڑے ہی دیر بعد مجھے لوگوں نے خبر دی کہ بی۔ ایس۔ ایف اور سی۔ آر۔ پی۔ کے کئی سو جوان مدرسہ کا محاصرہ کر رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ میری گرفتاری کے لیے آئے ہیں میں بھی تیار ہو کر اپنے دارالاہتمام میں آ کر بیٹھ گیا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پولس انسپکٹر اپنی فورس کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہوئے اور مجھے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد تین گھنٹے تک مدرسہ اور ہوسٹل کی تلاشی لی گئی لیکن کوئی قابل اعتراض چیزیں نہیں ملی، ایک رات حراست میں رکھنے کے بعد دوسرے دن مجھے جیل بھیج دیا گیا۔'' (38)

ارشد القادری کے گرفتار ہونے کے بعد ان کے خلاف اخبارات کی زہر افشانی شروع ہو جاتی ہے، جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی فعال شخصیت سے اسلام دشمن عناصر کس قدر خوف زدہ تھے۔

روزنامہ نو بھارت ہندی، 3 ستمبر، 1979 رائے پور لکھتا ہے: (ہندی سے اردو ترجمہ)

''دنگا بھڑکانے کے جرم میں مولانا ارشد القادری گرفتار (ہمارے نامہ نگار کے مطابق) جمشید پور میں دنگا بھڑکانے کے الزام میں مولانا ارشد القادری کو کل دن کے دو بجے گرفتار کرلیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ 25 اگست کو مولانا ارشد القادری نے عید کی نماز پڑھاتے وقت (حکومت بہار کے خلاف) بہت ہی زہریلی تقریر کی تھی موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق ارشد القادری کو پولس پچھلے تین دنوں سے تلاش کر رہی تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ مولانا ارشد القادری کے گرفتاری کے بعد رانی کدر محلے میں ایک دھماکہ ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی گرفتاری کے ردعمل کے طور پر ہی یہ دھماکہ ہوا۔''(39)

روزنامہ 'نو بھارت' رائے پور، ارشد القادری سے متعلق دوسرے دن لکھتا ہے: (ہندی سے اردو ترجمہ)

''جمشید پور۔ پیر۔ یہاں کے ایک مذہبی قائد مولانا ارشد القادری کی گرفتاری کے بعد دنگوں سے متاثر اس شہر کا ماحول اکثر پرسکون رہا اور کوئی بھی پرتشدد واردات نہیں ہوئی۔ پولس اور انتظامیہ کے افراد نے شہر کے مختلف علاقوں کا مستعدی کے ساتھ اپنا گشت جاری رکھا لیکن گزشتہ رات مولانا ارشد القادری کے رہائش گاہ پر جو چھاپہ مارا گیا تھا اس چھاپے میں کثیر تعداد میں مہلک ہتھیار ملے۔ اس ضمن میں سنگھ بھوم ضلع جنتا پورٹی کے سیکریٹری ویجے کمار سنگھ نے ایک بیان میں مولانا ارشد القادری کو جمشید پور جیل سے ہزاری باغ منتقل کرنے کی مانگ کی تاکہ دوبارہ نقص امن کا خطرہ نہ ہو، معلوم رہے کہ ویجے کمار سنگھ نے ہی مولانا ارشد القادری کی گرفتاری کی مانگ کی تھی۔ ساکچی، بھالوباسا، مانگو اور بستر پور میں کل بند رکھا گیا۔ شہر کے دیگر علاقوں میں حالات معمول پر رہا۔''(40)

ارشد القادری کی حمایت میں شائع شدہ اردو اخبارات کی کچھ رپورٹ اور سرخیاں ملاحظہ کریں:

''صدائے عام، پٹنہ، 2 ستمبر، 1979 — مولانا ارشد القادری جیسے مذہبی رہنما کو رہا کیا جائے۔ لیڈر حزب مخالف کا مطالبہ۔ پٹنہ 20 ستمبر، جناب نصر الدین حیدر خاں لیڈر، حزب مخالف (کانگریس آئی) بہار کاؤنسل نے ایک بیان میں یہ کہا ہے کہ جمشید پور میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے حکومت اسے اگر ایک طرف روکنے کی کوشش کر رہی ہے تو دوسری طرف ایک مذہبی رہنما مولانا ارشد القادری کو گرفتار کر کے حالات کو اور بھی سنگین بنا رہی ہے۔ جہاں تک مولانا ارشد القادری کی گرفتاری کا سوال ہے تو اس کا مقصد اقلیت کے ساتھ ناانصافی ہے اور ان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا ہے۔ جب کہ اس سے قبل کے فرقہ وارانہ فساد میں دینا ناتھ پانڈے اور آر۔ ایس۔ ایس، کے دوسرے بہت سارے لوگ ملوث تھے اور ان پر قتل کے بھی بہت سے مقدمے ہیں، لیکن ان لوگوں کو ابھی تک نہ تو حکومت نے گرفتار کیا

ہے اور نہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کی ہے۔'' (41)

کلکتہ کے روزنامہ آزاد ہند 4 ستمبر، 1979 نے حکومت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا کہ:

''جمشید پور میں سیاسی مقاصد کے تحت فساد کرایا گیا۔'' داس وزارت کو اب اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں: (مشرا کا بیان): ''مولانا ارشد القادری کو ہتھکڑی پہنا کر سڑکوں پر گھمانے کی پرزور مذمت۔''

جمشید پور میں مسلمانوں کے ایک مذہبی رہنما مولانا ارشد القادری کی گرفتاری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر مشرا نے کہا کہ گرفتاری کے بعد مولانا کو ہتھکڑی پہنا کر سڑکوں پر گھمایا گیا اور انھیں بدترین جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ لاکپ میں بند کیا گیا.....فساد سے متاثر خاندان کو بڑے پیمانے پر ریلیف فراہم کیا جائے اور مولانا ارشد القادری کو فوراً رہا کیا جائے۔'' (42)

ارشد القادری کی گرفتاری سے متعلق روزنامہ سیاست جدید، کانپور، یو۔ پی، 5 ستمبر، 1979 لکھتا ہے:

''جمشید پور کا حالیہ فساد ہریجنوں اور اقلیتوں کو ٹکرانے کے لیے کرایا گیا۔ ہریجن نوجوانوں کے دماغوں کے اندر تشدد اور تعصب ٹھونسا جا رہا ہے۔ مولانا ارشد القادری کو گرفتار کرنا پھر سڑکوں پر گشت کرانا انتہائی افسوس ناک ہے۔ ان کی گرفتاری صرف اس لیے ہوئی کہ وہ اندرا کانگریس کے حامی ہیں۔ جن تین ہزار عورتوں اور بچوں کا کیمپ مولانا چلا رہے تھے وہ اب کھانے سے محروم ہیں۔ فسادی آزاد گھوم رہے ہیں۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی تحقیقاتی رپورٹ۔ (43)

آخر کار ارشد القادری کو حکومت بہار نے رہا کر دیا کیونکہ ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کو بھاری عوامی دباؤ بھی سہنا پڑ رہا تھا۔ ارشد القادری کی رہائی سے متعلق روزنامہ غازی، کلکتہ۔ 18 نومبر، 1979ء لکھتا ہے:

''مولانا ارشد القادری رہا۔ کمیشن ملتوی، جمشید پور کے مسلمان پر بہار حکومت کے مظالم کا سلسلہ دراز۔'' (44)

ارشد القادری رہائی کے بعد مظلوم اور بے گناہ مسلمانوں کی مدد میں پھر سے لگ گیے۔ ان مسلسل مصائب اور سازشوں کے باوجود بھی ارشد القادری نے ملک وقوم کے لیے کبھی قدم پیچھے نہیں کھینچی۔ انھوں نے اپنے قلم اور صالح صحافتی اقدار کو فروغ دیا اور ملی وملکی جذبے کے تحت عوامی فلاح و بہبود اور تعلیمی مہم جاری رکھا۔

تصنیفات و تالیف

ارشد القادری کو تصنیف و تالیف سے گہرا لگاؤ تھا۔ یوں تو آپ کے تحقیقی، علمی، دینی، فکری، اصلاحی، سماجی، ادبی اور سیاسی مضامین سے ہندوستان کے اکثر مشہور مجلّات و جرائد بھرے پڑے ہیں اور بے شمار کتابوں پر آپ کے گرانقدر مقدمات کتابوں کو زینت بخشنے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مصنف و مؤلف اور ادیب ہونے کے ثبوت ہیں ان سب کے باوجود آپ کی تصانیف آپ کی علمی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ کے تصنیفات کی ایک لمبی فہرست ہے، جو حسب ذیل ہے:

(1) زلزلہ (2) زیر و زبر (3) جماعت اسلامی (4) تبلیغی جماعت (5) رسالت محمدی کا عقلی ثبوت (6) انوار احمدی (7) زلف و زنجیر (8) محمد رسول اللہ قرآن میں (9) دور حاضر کے منکرین رسالت (10) دل کی مراد (11) جلوۂ حق (12) شریعت (13) لسان الفردوس (14) مصباح القرآن (3 حصوں میں) (15) نقش کربلا (16) فن تفسیر میں امام احمد رضا کا مقام (17) ایک سفر دہلی سے سہارن پور تک (18) لالہ زار (19) سرکار کا جسم بے سایہ (20) تعزیرات قلم (21) دعوت انصاف (22) تاریخ فقہ حنفی (23) تاریخ فن حدیث (24) حیات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (25) تفسیر سورۃ فاتحہ (26) عقیدۂ علم غیب پر قرآنی دلائل (27) مطالعہ دیوبندیت (28) عقیدہ توحید پر عقلی دلائل (29) آؤ حج کریں۔

قیام تعلیمی ادارے (اندرون ملک):۔

ارشد القادری نے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، جو آج بھی بحسن و خوبی اپنے مشن میں لگے ہوئے ہیں کثیر تعداد میں طلبہ ان مدارس سے فارغ ہو کر ملک اور بیرون ملک میں اپنا خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ارشد القادری کے قائم کردہ ادارے مندرجہ ذیل ہیں:۔

(1) جامعہ فیض العلوم۔ جمشید پور	(2) دارالعلوم ضیاء الاسلام۔ ہوڑہ
(3) دارالعلوم مخدوم۔ گوہاٹی	(4) مدرسہ مدنیۃ العلوم۔ بنگلور
(5) مدرسہ مفتاح العلوم، راورکیلا	(6) مدرسہ اسلامی مرکز۔ رانچی
(7) دارالعلوم گلشن بغداد۔ ہزاری باغ	(8) جامعہ غوثیہ رضویہ۔ سہارن پور
(9) مدرسہ مدنیۃ الرسول۔ کوڈرما	(10) مدرسہ مظہر حسنات۔ رام گڑھ
(11) دارالعلوم رشیدیہ رضویہ۔ بلیا۔	(12) جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی
(13) فلاحی مرکز۔ جمشید پور	(14) مدرسہ تنویر الاسلام۔ جمشید پور

(15) فیض العلوم مڈل اسکول۔ جمشید پور (16) فیض العلوم ہائی اسکول۔ جمشید پور
(17) مدرسہ عزیز الاسلام۔ جمشید پور (18) مدرسہ اصلاح المسلمین، جمشید پور
(19) مدرسہ تعمیر ملت۔ تلیا کرماٹانڑ (20) مدرسہ امداد الحنفیہ۔ دمکا
(21) مدرسہ سراج الاسلام۔ مدھوپور، دیوگھر۔

قیام تعلیمی ادارے (بیرون ممالک):۔

(1) جامعہ مدنیۃ الاسلام — ہالینڈ
(2) اسلامک مشنری کالج — انگلینڈ
(3) دارالعلوم علیمیہ — سرینام، امریکہ

قیام مساجد:۔

ارشد القادری نے جہاں دینی تعلیم کے حصول کے لیے مدرسے قائم کیے اور جہاں مسجد کی ضرورت محسوس کی وہاں مسجد بھی بنائے۔ ارشد القادری کے ذریعے قائم کردہ مساجد درج ذیل ہیں:۔

(1) فیض الاسلام، مکہ مسجد۔ جمشید پور (2) نورانی مسجد۔ جمشید پور
(3) قادری مسجد۔ بہار شریف (4) مسجد مفتاح العلوم۔ راورکیلا
(5) مسجد غوثیہ۔ رانچی (6) مسجد اہلسنت۔ کوڈرما
(7) مدینہ مسجد۔ جمشید پور (8) مدینہ مسجد۔ موسیٰ نبی

قیام تبلیغی ادارے (بیرون ممالک)

ارشد القادری نے بیرون ممالک میں دو تبلیغی ادارے قائم کیے ہیں۔ (1) ورلڈ اسلامک مشن — انگلینڈ (2) دعوت الاسلامی — کراچی، (پاکستان)۔

کانفرنسوں میں بحیثیت مندوب شرکت (بیرون ممالک)۔

ارشد القادری نے مندرجہ ذیل کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔

(1) کلچرل کانفرنس — ایران (2) اسلامی عالمی کانفرنس — لیبیا
(3) حجاز کانفرنس — انگلینڈ (4) امام احمد رضا کانفرنس — پاکستان
(5) مولانا عبدالعلیم کانفرنس — ہالینڈ (6) عالمی اسلامی کانفرنس — عراق
(7) عالمی میلاد کانفرنس — پاکستان۔

مناظرہ :

ارشد القادری نے الگ الگ موضوعات پر کئی صوبوں میں جا کر مناظرے کیے۔

پہلا مناظرہ— ارشد القادری۔ ہمراہ— مولوی عبداللطیف نعمانی دیوبندی
بمقام: کٹک، (اڑیسہ)

دوسرا مناظرہ— ارشد القادری۔ " " مولوی عبدالسلام لکھنوی، دیوبندی
بمقام: بتھوا بازار، چھپرہ (بہار)

تیسرا مناظرہ— ارشد القادری۔ " " مولوی ارشاد احمد دیوبندی
بمقام: نیر ضلع۔ امراوتی۔ مہاراشٹر

چوتھا مناظرہ— ارشد القادری۔ " " مولوی ارشاد احمد دیوبندی
بمقام: بولیا، مندسور، (راجستھان)

پانچواں مناظرہ— ارشد القادری۔ " " مولوی طاہر گیاوی
بمقام: جھریا، ضلع، دھنباد، (جھارکھنڈ)

چھٹا مناظرہ— ارشد القادری۔ " " مولوی طاہر گیاوی
بمقام: کٹک، (اڑیسہ)

وفات —ارشد القادری کی طبیعت جب ناساز رہنے لگی تب وہ کئی مہینوں سے جمشید پور میں ہی رہ رہے تھے۔ ارشد القادری کا پیشاب بند ہو جانے کی وجہ سے سب سے پہلے انھیں ٹاٹا مین ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا۔ ڈاکٹروں کی ہزار کوششوں کے باوجود پیشاب نہیں ہو سکا تو ان لوگوں نے ناف کے نیچے ایک ہلکا سا چیرا لگا کر وہاں پیشاب نکالنے کے لیے ایک پائپ ڈال دیا اور یہی ان کی وفات کا سبب بنا۔ جب ارشد القادری کی طبیعت بہت زیادہ بگڑنے لگی تو انھیں دہلی کے AIIMS ہاسپٹل میں 29 اپریل، 2002 کو لایا گیا۔ ارشد القادری زیر علاج تھے کہ اچانک ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور اسی روز شام 4:35 پر ان کی روح پرواز کر گئی۔ بجلی کی طرح یہ خبر پوری دنیا میں پھیل گئی کہ ارشد القادری اس دنیا میں نہیں رہے۔ ارشد القادری کے جسد خاکی کو 30 اپریل، 2002 کو انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ سے صبح 9:45 پر رانچی لے جانے کا بندوبست کر دیا گیا۔ دوپہر 1:25 پر ارشد القادری کا جسد خاکی برسا منڈا ایئر پورٹ رانچی پہنچا۔ رانچی میں پچاس ہزار کا ایک جم غفیر جو رانچی سمیت، جھارکھنڈ کے مختلف اضلاع اور علاقوں سے آئے تھے اس کے علاوہ پٹنہ سے بھی ارشد القادری کے دیدار کے لیے لوگ آئے۔ جن میں بالخصوص

ملک کے ممتاز سیاسی رہنما جناب لالو پرساد یادو سابق وزیر اعلیٰ، بہار، حکومت جھارکھنڈ کے وزیر توانائی مسٹر لال چند مہتو، جناب محمد سعید صاحب سر پرست ادارۂ شرعیہ، جھارکھنڈ، مولانا غلام رسول بلیاوی و دیگر وزرائے جھارکھنڈ و بہار موجود تھے۔ یکم مئی بروز بدھ، 2002 بعد نماز فجر ارشد القادری کے جسد خاکی کو عام لوگوں کی زیارت کے لیے ریاست جھارکھنڈ کی عظیم الشان مسجد فیض العلوم مکہ مسجد کے صحن میں رکھا گیا اور تابوت کھول دیا گیا جہاں ہزاروں متوالے اپنے رہبر کی زیارت کے لیے جوق در جوق آنا شروع ہو گیے۔

یکم مئی، 2002 بروز بدھ پانچ بجے نماز عصر ادا کی گئی، نماز عصر کے بعد ارشد القادری کا جنازہ اٹھا، لاکھوں کا ہجوم کسی کے قابو میں نہیں تھا۔ پوری فضا ارشد القادری، زندہ باد، مفر اسلام، پائندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اسی عالم میں دھتکیڈیہہ عید گاہ میدان میں لاکھوں عقیدت مندوں کے ہجوم میں چھ بج کر بیس منٹ پر محدث کبیر حضرت علامہ ضیاالمصطفیٰ قادری، شیخ الحدیث الجامعۃ اشرفیہ، مبارک پور نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر سات بج کر بیس منٹ پر جامعہ فیض العلوم کے جنوبی حصے میں واقع سرسبز و شاداب باغ میں ارشد القادری کی تدفین عمل میں آئی۔ اخباری اعداد و شمار کے مطابق کل تقریباً دو لاکھ افراد نے ارشد القادری کے جنازے میں شرکت کر کے اپنے محسن کو خراج عقیدت پیش کیا۔

حواشی:

1۔رئیس القلم نمبر۔ص۔148۔مکتبہ جام نور، دہلی۔ 2002

2۔کاروان رئیس القلم۔ص۔15۔ذاکر نگر، دہلی۔2007

3۔رئیس القلم نمبر۔ص۔7۔مکتبہ جام نور، دہلی۔2002

4۔کاروان رئیس القلم۔ص۔19،ذاکر نگر، دہلی۔2007

5۔رئیس القلم نمبر۔ص۔28-27، مکتبہ جام نور، دہلی۔2002

6۔کاروان رئیس القلم نمبر۔ص۔34، ذاکر نگر، نئی دہلی۔2007

7۔ایضاً۔ص۔35

8۔رئیس القلم نمبر۔ص۔253، مکتبہ جام نور، دہلی۔2002

9۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔13،المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

10۔رئیس القلم نمبر۔ص۔134، مکتبہ جام نور، دہلی۔2002

11۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔31۔المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

12۔خوشتر نورانی۔(مرتب) ارشد کی کہانی، ارشد کی زبانی۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2007

13۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔33،المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

14۔خوشتر نورانی۔(مرتب) ارشد کی کہانی، ارشد کی زبانی۔ص۔27-26 مکتبہ جام نور۔دہلی۔2007

15۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔35-34۔المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

16۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔42۔المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

17۔مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔ص۔51۔المجمع المصباحی۔مبارک پور۔2002

18۔رئیس القلم نمبر۔ص۔168۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

19۔رئیس القلم نمبر۔ص۔69-168۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

20۔رئیس القلم نمبر۔ص۔29-128۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

21۔رئیس القلم نمبر۔ص۔130۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

22۔رئیس القلم نمبر۔ص۔148۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

23۔رئیس القلم نمبر۔ص۔150۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

24۔کاروان رئیس القلم نمبر۔ص۔53۔ذاکر نگر،نئی دہلی۔2007

25۔رئیس القلم نمبر۔ص۔15-114۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

26۔رئیس القلم نمبر۔ص۔116۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

27۔رئیس القلم نمبر۔ص۔117۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

28۔رئیس القلم نمبر۔ص۔118۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

29۔رئیس القلم نمبر۔ص۔19-118۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

30۔رئیس القلم نمبر۔ص۔119۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

31۔رئیس القلم نمبر۔ص۔119۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

32۔رئیس القلم نمبر۔ص۔121۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

33۔رئیس القلم نمبر۔ص۔74۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

34۔رئیس القلم نمبر۔ص۔71۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

35۔رئیس القلم نمبر۔ص۔73۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

36۔ارشد القادری۔زیر و زبر۔ص۔5۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔1986

37۔رئیس القلم نمبر۔ص۔76-75۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

38۔ارشد القادری۔زیر و زبر۔ص۔6۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔1986

39۔رئیس القلم نمبر۔ص۔77-76۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

40۔رئیس القلم نمبر۔ص۔77۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

41۔رئیس القلم نمبر۔ص۔78-77۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

42۔رئیس القلم نمبر۔ص۔78۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

43۔رئیس القلم نمبر۔ص۔80۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

44۔رئیس القلم نمبر۔ص۔81۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔2002

باب دوم

مذہبی نثر کے اہم اسالیب

مذہبی نثر کے اہم اسالیب

اردو زبان و ادب کے فروغ میں علماء، صوفیا، مدارس اور خانقاہوں کی زریں خدمات تو تاریخ لسانیات کا ایک تابندہ و روشن باب ہے۔ لیکن عصبیت و تنگ نظری نے ان خدمت گزاروں کی جدو جہد کا آئینہ دھندلا کر دیا اس لیے ان کی کوششیں بیکار ہو گئیں جب کہ اردو زبان و ادب کی ترقی و خوشحالی کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس ضمن میں کی جانے والی تمام کاوشوں کو سرمایہ ادب کا حصہ بنایا جائے اور ان پر نقد و نظر کی کرنیں بکھیر کر ان نقوش کو روشن سے روشن تر کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا بلکہ مذہبی ادب کو تاریخ ادب اردو سے الگ رکھ کر ایک غلط فکر و نظر کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کا یہ اقتباس قابل ذکر ہے:

''اس المیے کا ماتم کہاں تک کیا جائے کہ اردو تاریخ ادب نے ہمارے علمائے کرام کو تقریباً نظر انداز کر دیا ہے جنھوں نے دین و سنیت کی چاکری کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی اور تبلیغ دین کے لیے تصانیف کے انبار لگا دیئے علمائے کرام کے ملفوظات اور ان کی دیگر تصانیف کو اگر تاریخ ادب اور تاریخ لسانیت نے موضوع گفتگو بنایا ہوتا تو ہماری زبان و بیان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اجاگر ہو کر اردو کا ایک نیا منظر نامہ پیش کرتیں۔''(1)

پروفیسر شفقت رضوی نے بھی اس سے متعلق لکھا ہے کہ:

''ہمارے علمائے ادب مذہبی لٹریچر کو مانتے ہی نہیں ہیں اس لیے ادبی تواریخ کے صفحات مذہبی لٹریچر کے ذکر سے خالی ہیں۔''(2)

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں علمائے کرام کی ایثار و قربانی کو صرف نظر کر کے اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جا سکتی۔ چوں کہ ان مقدس حضرات کا مطمح نظر تبلیغ دین۔ اشاعت اسلام اور خلق خدا کی رہنمائی تھا لہذا نام و نمود سے دامن کشی ہو کر وہ عظیم خدمت میں خود کو مصروف کیے رہے۔ مذہبی ادب کو تاریخ ادب سے الگ تھلگ رکھنا غیر صحت مند رجحان ہے۔ اردو زبان تو ابتدا سے ہی خانقاہ و مدارس کی مرہون منت رہی اور بعد کے ادوار میں بھی اردو ادبیات کا دامن مذہبیات کے قابل قدر سرمائے سے مالا مال رہا۔

مذہبی نثر کے اہم اسالیب پہ گفتگو کرنے سے قبل نثر کی وضاحت ضروری ہے اس کے بعد اسلوب کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ یوں تو ہمارے ادیبوں نے نثر کی تعریف الگ الگ طرح سے پیش کیے ہیں جسے شہاب ظفر

اعظمی نے اپنی کتاب سار دو کے نثری اسالیب میں بہت ہی سلیقے سے جامع اور مختصر بنا کر پیش کیا ہے، جس سے نثر کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ارباب علم و ادب نے نثر کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔ مثلاً صاحبِ بحر الفصاحت کے حوالے سے پروفیسر محمد الدین قادری زورؔ الفاظ کے اعتبار سے نثر کی چار اقسام بتاتے ہیں۔ مرجز، مقفی، مسجع، عاری، پھر معنی کے اعتبار سے بھی نثر کی چار قسمیں شمار کی ہیں۔ سلیس، سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ اور دقیق رنگین، نثر کی ان اقسام کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ نے محاوراتی نثر، الہلالی نثر، انشائے لطیف کی شاعرانہ نثر اور مزاح نگاری کی گلابی اردو نثر کا بھی ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں فارسی کے زیر اثر تعقیدی نثر کا بھی زورؔ صاحب نے بیان کیا ہے جو الفاظ اور معنی کے الٹ پھیر سے تشکیل پاتی ہے۔ ڈاکٹر حامد حسین کے خیال میں استعمال کے لحاظ سے نثر کی چار قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ کلامی نثر، بیانیہ نثر، استدلالی نثر اور ادبی نثر، پروفیسر قاضی عبد الستار نثر کو تین حصوں ''ترسیلی نثر، علمی نثر، اور تخلیقی نثر میں تقسیم کرتے ہیں۔ نثر کی ان انواع کے علاوہ عربی اور فارسی سے مغلوب و متاثر نثر کو بالترتیب معرب اور مفرس نثر کا نام دیا جاتا ہے۔ نثر کی یہ مختلف اقسام اپنے اپنے نقطہ نظر سے صحیح ہیں اور نثر کی وسعت وتنوع کو ظاہر کرتی ہیں۔ نثر کا تعلق اس کے موضوع سے بہت گہرا ہوتا ہے، ناول، افسانے اور تنقید سے لے کر خطوط ڈائری اور اخبار تک سب کچھ نثر میں ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے اس کی ہیئت میں تنوع کا ہونا تعجب خیز نہیں۔ اس میں شاعرانہ احساسات وخیالات کے ساتھ ساتھ علوم انسانی کے اظہار کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ اس لحاظ سے سیدھے سادے طور پر ہم نثر کو اس کی تمام اصناف کے ساتھ تقسیم کریں تو صرف دو واضح شکلیں سامنے آتی ہیں۔ مشترک نثر (یعنی سادہ) اور منفرد نثر (یعنی ادبی)۔'' (3)

یہ تو ہوئی نثر کی تعریف، اس سے متعلق دوسری جگہ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی باتوں کو تحریر کرتے ہیں۔ جس سے مصنف کی شخصیت تعمیر ہوتی ہے:

''نثر لکھنے یا بولنے والا جس جگہ آنکھ کھولتا ہے جس ماحول میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے جو تہذیبی اور معاشرتی اثرات اسے ورثے میں ملتے ہیں۔ جن حالات میں اس کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے، جن لوگوں سے وہ متاثر ہوتا ہے، اس کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ جو ذہنی رجحانات اس کے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ جن مصنفوں کا وہ مطالعہ کرتا ہے اور جو خیالات ونظریات اس کے یہاں تشکیل پاتے ہیں ان سب کے مجموعی اثرات سے اس کا مخصوص انداز آہنگ اور لب ولہجہ وجود اختیار کرتا ہے اور اس سے اس کی وہ نثر

پہچانی جاتی ہے جس کو وہ بولنے یا لکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔''(4)

اسلوب کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نثر کو۔ اسلوب کی تعریف سے متعلق شہاب ظفر اعظمی اپنی کتاب میں ادیبوں کی رائے کو پیش کرتے ہیں:

''اسلوب' کے لغوی معنی طرز، اسٹائل، اور پیرایہ کے ہیں۔ اصطلاح میں اسلوب کسی ادیب کے انفرادی انداز بیان یا طرز اظہار کو کہتے ہیں جو اس ادیب کی پہچان بن جائے۔ شاید اسی لیے اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی صحافی بوفان (BUFFON) نے کہا تھا کہ 'اسلوب مصنف کی شخصیت کا دوسرا نام ہے' فلابر (FLAUBERT) اور اسٹنڈ ال (STENDAL) نے بھی تسلیم کیا ہے کہ 'اسلوب لکھنے والے کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے اور لکھنے والا اپنے اسلوب سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی بات کو استعارے میں یوں کہا ہے کہ 'اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ یہ انسان کی جلد ہے۔' ان تمام تعریفوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلوب کا انشا پرداز کی شخصیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے، اس سے مراد وہ منفرد انداز بیان ہوتا ہے جس کے آئینے میں ہم مصنف کی شخصیت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں خواہ وہ شخصیت کا خارجی پہلو ہو یا داخلی۔ ایک منفرد شخصیت کی تعمیر میں جو عناصر کارفرما ہوتے ہیں وہی مخصوص اسلوب کی بھی تشکیل کرتے ہیں۔''(5)

مذہبی نثر کے اہم اسالیب سے متعلق میں نے جن ادیبوں کو شامل کیا ہے ان کے اسمائے گرامی ہیں: (1) مولانا شبلی نعمانی (2) سید سلیمانی ندوی (3) سید ابوالحسن علی ندوی (4) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (5) مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔

اب باری باری سے ان تمام ادیبوں کے اسلوب پہ بحث کی جائے گی۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں اردو کے فروغ میں ان تمام ادیبوں کا اہم رول رہا ہے۔ ہم انھیں کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ مذہبی لٹریچر بھی اردو ادب کا ایک حصہ ہے۔ بھلے ہی ہم اسے آج تک نظر انداز کرتے آئے ہوں مگر یہ سچ ہے کہ علماؤں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے اردو ادب کی آبیاری کی ہے انھیں ادیبوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے سامنے اردو میں مذہبی لٹریچر کا ذخیرہ موجود ہے۔

(1) مولانا شبلی نعمانی — (1857-1914) انھوں نے کئی مذہبی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس طرح تحقیق و تاریخ اور سوانح نگاری کے اصولوں کو برت کر نادر و نایاب مذہبی لٹریچر تیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی چند اہم

کتابیں ہیں الغزالی، الفاروق، المامون، سیرت النبی، یہی وہ کتابیں ہیں جن کا اسلوب اردو ادب میں جگہ پانے کے قابل ہیں۔ جنھیں آج تک صحیح مقام نہیں مل سکا ہے، الغزالی بھی شبلی کی ایسی ہی ایک کوشش ہے جو اپنے طرز استدلال اور اسلوب کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

امیر اللہ خان شاہین اپنی کتاب میں الغزالی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔

شبلی نے امام غزالی کا تعارف اپنے مخصوص انداز میں کراتے ہوئے لکھا:

''آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر ہو جاتے لیکن بیار آر حریفاں بادہ پیمارا کے لحاظ سے افادہ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ امیر و غریب عام و خواص عالم و جاہل رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ علما جو دلیل راہ بن سکتے تھے طلب جاہ میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اس حالات میں یہ کتاب لکھی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادت اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے۔ زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے جو رہ گئے ہیں وہ نام کے عالم ہیں۔'' (6)

الفاظ کا یہ انتخاب جملوں کی ساخت لفظوں کی بندشیں یہ سب ذمہ داریاں شبلی کے اسلوب کو شگفتہ بناتے ہیں۔ شبلی کی نثر سنجیدہ پر تاثیر اور با وقار ہے، الفاظ و خیال اور جمالیات کا جیسا خوبصورت امتزاج شبلی کے یہاں ملتا ہے، اردو کے کسی دوسرے نثر نگار کے یہاں موجود نہیں ہے۔ ان کی نثر پر فارسی روایت کا خوشگوار اثر پڑا ہے۔

شبلی کی نثری خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں:

''شبلی کی نثر بھی بے ساختہ ہوتی ہے۔ مگر نہایت چست، مدعا نگاری وہ بھی کرتے ہیں مگر کہنے کا انداز پر تکلف ہوتا ہے۔ ان کی عبارتیں جن سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، مگر طریق ایسا ہوتا ہے کہ تکلف اور اہتمام بالکل نہیں ہوتا۔'' (7)

مولانا شبلی کے اسلوب میں اختصار و جامعیت پائی جاتی ہے، وہ غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے عہد کے لوگ جن باتوں کو صفحات میں ادا کرتے تھے شبلی اس کو چند سطروں میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ شبلی کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تلمیحات اور استعارات سے کام لیتے ہیں جس سے ان کی نثر میں اختصار اور جامعیت کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اختصار سے بات گنجلک ہو جائے بلکہ اختصار کے

باوجود پورا زور واثر قائم رہتا ہے جیسے سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں:

''کارکنانِ قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، عالم قدس کے انفاس، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی، جان نوازی صبح سب اس لیے تھے کہ متاع ہائے گراں شہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکت، ارم اوج چیں کے قصر ہائے، فلک بوس گر پڑے، آتش فارسی نہیں آتش کدۂ کفر آزر کدۂ گمر ہی سرد ہو کر رہ گیے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی بت کدے خاک میں مل گیے۔ شیرازہ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گیے، توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آ گئی آفتاب ہدایت کی شعائیں ہر طرف پھیل گئیں۔''(8)

لفظی سطح پر جب ہم دیکھتے ہیں تو شبلی مرکب الفاظ کا استعمال خوب کرتے ہیں جس سے ایک طرح کی صوتی تکرار پیدا ہو جاتی ہے۔ شبلی کے یہاں عربی و فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ کیوں کہ شبلی بنیادی طور پر فارسی وعربی کے آدمی تھے۔ ان کی تخلیقی زبان فارسی کے ساتھ ساتھ عربی بھی ہے۔

شبلی کی دیگر کتابوں کے علاوہ الفاروق کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے، یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں تمہید کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحاتِ ملکی کے حالات ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے۔ ایک طویل مدت یعنی سو سال سے زائد گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔ الفاروق میں شبلی کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے عربی اور فارسی کے الفاظ کم استعمال ہوئے ہیں۔ دقیق اور پیچیدہ الفاظ کم ہیں، جملے عام فہم ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے شبلی کے یہاں سادگی، بے تکلفی، روانی، استدلال، نرمی، معقولیت اور لفظوں کا برجستہ استعمال اور وضاحت پائی جاتی ہے۔ الفاروق میں تکلف اور بناوٹ کا بالکل دخل نہیں ہے۔ شبلی کا مشن کتنا بڑا اور ان کے مقاصد کتنے وسیع تھے۔ ادب میں اس وقت ایسی زبان و اسلوب کی ضرورت تھی جو ہر طرح کے مناسب اظہار کے لیے موزوں ہو، شبلی نے حضرت عمر کی ولادت سے وفات تک کے واقعات کو اپنی تحریروں میں سمیٹ لیا ہے۔ الفاروق کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''البتہ ایک محقق کی نگاہ اس بات پر پڑ سکتی ہے کہ اس صیغے میں فتوحات فاروقی کی خاص ایجادات اور اصلاحیں کیا ہیں، اور ہم اسی خاص پہلو پر نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں، سب سے بڑا انقلاب جو حضرت عمرؓ نے اس صیغے میں کیا، اور جس کی وجہ سے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی دفعتاً نہایت ترقی کر گئی۔ یہ تھا کہ

زمینداری اور ملکیت زمین کا جو قدیم قانون تھا، اور بالکل جابرانہ تھا، مٹا دیا، رومیوں نے جب شام اور مصر پر قبضہ کیا تو تمام اراضیات اصلی باشندون سے چھین کر کچھ افسرانِ فوج اور کچھ اراکین دربار کو دے دیں کچھ شاہی جاگیر قرار پائیں، کچھ کلیسا اور چرچ پر وقف کر دی گئیں، اصلی باشندوں کے ہاتھ میں ایک چپہ زمین بھی نہیں رہی۔ وہ صرف کاشتکاری کا حق رکھتے تھے، اور اگر مالک زمین ان کی کاشتکاری کی زمین کو کسی کے ہاتھ منتقل کرتا تھا، تو زمین کے ساتھ کاشتکاری بھی منتقل ہو جاتے تھے۔ اخیر اخیر میں باشندوں کو بھی کچھ زمینداریاں ملنے لگیں، لیکن زمینداری کی حفاظت اور اس سے متمتع ہونے کے لیے رومی زمینداروں سے اعانت لینی پڑتی تھی اس بہانے سے زمیندار خود اس زمین پر متصرف ہو جاتے تھے اور وہ غریب کاشتکار کا کاشتکار رہ جاتا تھا، یہ طریقہ کچھ رومی سلطنت کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام دنیا میں قریب قریب یہی طریقہ جاری تھا کہ زمین کا بہت بڑا حصہ افسرانِ فوج یا ارکان دولت کی جاگیر میں دیدیا جاتا تھا۔'' F.Note.(9)

شبلی نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کے سامنے اسلوب وتحریر کے دو واضح نمونے موجود تھے، سرسید اور محمد حسین آزاد کا۔ سرسید کے یہاں انگریزی الفاظ ویسے ہی یا تراش خراش کے بعد استعمال ہوئے ہیں۔ آزاد کے یہاں فارسی تراکیب واستعارے کی بہتات تھی، مگر شبلی کی ذات بندشوں سے قطعاً پاک تھی، شبلی کے اسلوب کی ایک نمایاں صفت عبارتوں کا خوبصورت اتار چڑھاؤ ہے۔

شبلی نے شاعرانہ انداز کے باوجود وہ طرز اختیار کیا ہے کہ استدلال، صداقت اور عملی توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کے یہاں اکثر مقامات پر طنزیہ فضا بھی نمایاں دیکھائی دیتی ہے۔ طنز کے لیے انھوں نے مختلف طریقے استعمال کیے ہیں۔

کبھی وہ جملہ معترضہ سے طنز پیدا کرتے ہیں تو کبھی اشعار سے کام لیتے ہیں۔ کبھی محاوروں سے شبلی کا پرجوش قلم معائب ہی نہیں محاسن کے بیان کو بھی ایسے جوش وخروش سے ظاہر کرتا ہے جس سے قاری کا دماغ تصورات کی خیالی دنیا میں غوطے لگانے لگتا ہے۔ جیسے شعرالعجم کا یہ اقتباس:

''یہ بدیہی بات کہ ملک کی آب وہوا، سبزی اور شادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعہ سے انشاء پردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کی جھنڈ، پہاڑی جھاڑیاں یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں، لیکن یہی عرب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔ ایران ایک قدرتی چمن

زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار اور آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختہ زمرد بن گئی، باد سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی مہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آ سکتا۔" (10)

شبلی کی نثر کے متعلق عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"شبلی کی نثر نے اردو ادب میں فصاحت و بلاغت کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ انھوں نے متنوع عالمانہ و محققانہ تصانیف ایک شستہ و شگفتہ زبان میں پیش کیا۔ ان کے حکیمانہ خیالات ایک ایسی نفاست و متانت کے ساتھ سامنے آئے جس میں پرداختگی کے باوجود بے ساختگی ہے۔ عربی و فارسی کے اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم ہونے کے باوجود شبلی نامانوس اور ثقیل الفاظ و تراکیب استعمال نہیں کرتے، ان کے جملے بہت صاف و صریح ہوتے ہیں اور ان کی عبارت نہایت محکم ہموار اور استوار ہوتی ہے۔ شبلی کا اسلوب بیان اردو کی ادبی نثر کا نمونہ کمال ہے۔" (11)

(2) سید سلیمان ندوی (1884-1953)— سید سلیمان ندوی شبلی کے عزیز شاگردوں میں ایک تھے۔ ویسے تو شبلی کے زیر سایہ بہت لوگوں نے ترتیب پائی۔ لیکن جو شفقت و محبت سلیمان ندوی کو ملی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ شبلی اور سید صاحب کے تعلقات بہت دنوں سے اور بہت گہرے تھے۔ وہ شبلی ہی تھے جنھوں نے سید صاحب کو ندوہ میں داخل کرانے کی رائے دی اور بعد میں سلیمان ندوی کو الندوہ کا نائب مدیر بنایا، جس سے سید صاحب کے صحافتی رجحان میں مدد ملی، اس کے بعد شبلی کے اثرات ان پر مرتب ہونے لگی۔ ایک اقتباس دیکھیں:

"خاکسار نے استاد محترم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس 1905 سے 1912 تک مسلسل گزارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی یہ دس برس درحقیقت ان کی بتیس برس کی علمی و قومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے بلکہ انھیں ان کی ستاون برس کی عمر کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔" (12)

اس سے شبلی اور سید صاحب کے گہرے تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی کی تربیت کی وجہ سے سید صاحب کو تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہوا اور سید صاحب کی تمام تصانیف پر شبلی کے اثرات بہت دور تک قائم ہوئے سلیمان ندوی صرف ایک سوانح نگار ہی نہ تھے بلکہ وہ ناقد، ادیب، شاعر، ماہر لسانیات اور سب سے بڑھ کر ان کی پہچان ایک مذہبی شخصیت کی شکل میں کی جاتی ہے، اس کے علاوہ سلیمان ندوی کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سید صاحب نے اپنے استاد شبلی کی سوانح حیات مرتب کی۔

سید سلیمان ندوی کا شمار ہمارے عظیم اور معتبر اہل قلم حضرات میں ہوتا ہے ان کی تحقیق و تنقید کا میدان زیادہ تر مذہبیات، عربی ادب اور تاریخ ہے، ان کی تحریروں پر سب سے پہلا اثر مولانا عبدالحلیم شرر کا ہے، جیسا کہ خود انھوں نے اس کی تصریح کی ہے۔ کہیں کہیں وہ محمد حسین آزاد کے طرز کو بھی جگہ دیتے رہے لیکن یہ دونوں طرز تحریر عارضی تھے۔ سید سلیمان، ابوالکلام آزاد اور شبلی کے طرز سے بہت متاثر ہوئے ہیں، انھوں نے ابو الکلام آزاد کے خطیبانہ اور پرجوش اسلوب کو بہت ہی خوبصورتی سے اپنایا ہے سلیمان ندوی نے آخر میں اپنے استاد کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا اور یہ اس لیے بھی تھا کہ ان کی علمی و ادبی تربیت زیادہ تر شبلی ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں خود اس بات کی وضاحت کر دی ہے چنانچہ عبدالحلیم شرر اور آزاد کے اسلوب سے وقتی اور عارضی طور پر متاثر ہونے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آنا پڑا کیونکہ علمی مضامین کے لیے ان کے طرز تحریر سے بڑھ کر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہیں۔ اس لیے بار بار ان سے اصلاحیں لیں۔ ان کی ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی تو علمی زندگی کا ایک نہج تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا۔'' (13)

سید سلیمان ندوی کے نثری اسالیب عالمانہ و ادیبانہ شان کے مظہر ہوتے ہیں لیکن اپنے اندر خشکی نہیں رکھتے بلکہ ہر جگہ ایک خاص قسم کی تر و تازگی، لطف اندوزی اور دلچسپی برقرار رہتی ہے، ان کے مزاج کی شوخی جو گوناں گوں پر چھائیاں پیش کرتی ہیں۔

اس وجہ سے جی چاہتا ہے کہ ان کا ذکر شبلی نعمانی، مہدی افادی اور نیاز فتحپوری کے ساتھ ہی کیا جائے کہ ان اکابر کے یہاں رومانیت کے روشن و شفاف اجالے مکتوبات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

''غم و غصہ، صدماتِ خانگی، شوخی و ظرافت، چھیڑ چھاڑ، دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت، ناگواری و طنز، سیاسی چاشنی، سب ہی کی جھلکیاں اپنی اپنی جگہ ان اوراق میں محفوظ ملیں گی۔'' (14)

سلیمان ندوی میں جو عالمانہ شان ہے اس میں انانیت نہیں ہے جبکہ ابوالکلام آزاد اور شبلی کے یہاں یہ لے اچھی خاصی بڑھی ہوئی ہے۔ سلیمان ندوی ایک مضمون نگار بھی ہیں، ادیب بھی، خطیب بھی، مؤرخ بھی، مصنف بھی۔ سیرۃ النبی میں نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت سے متعلق سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں، جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب ''قلب کا عالم'' اور فلسفہ ''نفسیات'' یا ''دماغی کیفیات'' کہتا ہے۔ اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں، جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کی صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں، اور ان کے مناسب شکل وصحت اور ماحول (گردوپیش) نہ اختیار کریں۔ تو ہم ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی، ہمارے تمام تمدنی، اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کے بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے رواجی رسوم و آداب اور قواعد وضوابط مقرر ہیں، معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت وتقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوی اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون وخاموشی، ادب ولحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گیے ہیں۔ شاہانہ رعب و داب کے اثرات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلوسوں، اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے، قوی ہیکل چوبدار عصا بردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمبدم دور باش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں۔ کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور وغوغا، اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزم عروس کے لیے رنگ و بو، نور و سرور۔ گانا بجانا اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے۔'' (15)

سید سلیمان ندوی کو سیرت نگاری اور سوانح نگاری کا فنی شعور بھی تھا اور مضمون کو برتنے کا فنی سلیقہ بھی اس کی شہادت ان کی تحریر کردہ سوانح عمریوں میں بخوبی ملتی ہیں۔ اردو ادب اور اسلامی ادب کے عظیم ترین سوانح نگاروں اور سیرت نویسوں کی اولین صف میں جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔

سید صاحب اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ اسلوب تحریر کے لیے ممتاز ہیں ان کی تصانیف میں عموماً ایک عالم اور محقق کا انداز بیان ملتا ہے، لیکن ادبی گلکاری اور بیان کی شگفتگی کے نمونے بھی قدم قدم پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ سیرۃ النبی اس کی زندہ مثال ہے۔

سید سلیمان ندوی کی دوسری کتاب سیرۃ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی نثری اسلوب کے حوالے سے کافی اہم ہے۔

ابتدائی حالات سے لے کر خاتمہ تک یعنی اول تا آخر شگفتہ بیانی سے کام لیا ہے۔ حضرت عائشہ کے بچپن کے بارے میں سیرۃ عائشہ میں لکھتے ہیں:

''غیر معمولی اشخاص اپنے بچپن ہی سے اپنے حرکات وسکنات اور نشو ونما میں ممتاز ہوتے ہیں، ان کے ایک ایک خط و خال میں کشش ہوتی ہے، ان کے ناصیۂ اقبال سے مستقبل کا نور خود بخود چمک چمک کر نتیجہ کا پتہ دیتا ہے، حضرت عائشہ بھی اسی قسم کے لوگوں میں تھیں، بچپن ہی میں ان کے ہر انداز سے سعادت اور بلندی کے آثار نمایاں تھے، تاہم بچہ بچہ ہے، وہ صرف کھیلتا ہے اور کھیلنا ہی اس کی عمر کا تقاضا ہے، حضرت عائشہ بھی لڑکپن میں کھیل کود کی بہت شوقین تھیں، محلّہ کی لڑکیاں ان کے پاس جمع رہتیں اور وہ اکثر ان کے ساتھ کھیلا کرتیں، لیکن اس لڑکپن اور کھیل کود میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہر وقت ملحوظ رہتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عائشہ کھیلتی ہوتیں، ارد گرد سہیلیوں کا ہجوم ہوتا، کہ اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ جاتے وہ جلدی سے گڑیوں کو چھپا لیتیں، سہیلیاں آپ کو دیکھ کر ادھر ادھر چھپ جاتیں، لیکن چونکہ آپ بچوں سے خاص محبت رکھتے تھے، اور ان کے کھیل کود کو برا نہیں سمجھتے تھے، اس لیے لڑکیوں کو پھر بلا بلا کر حضرت عائشہ کے ساتھ کھیلنے کو کہتے تھے، تمام کھیلوں میں ان کو دو کھیل سب سے زیادہ مرغوب تھے، گڑیا کھیلنا اور جھولا جھولنا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ گڑیاں کھیل رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا، جس کے دائیں بائیں دو پر لگے ہوئے تھے آپ نے استفسار فرمایا عائشہ! یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ گھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا گھوڑوں کے تو پر نہیں ہوتے۔ انھوں نے برجستہ کہا۔ کیوں؟ حضرت سلیمان کے گھوڑوں کے تو پر تھے۔ آپ اس بے ساختہ پن کے جواب پر مسکرا دیے، اس واقعہ سے حضرت عائشہ کی فطری حاضر جوابی مذہبی واقفیت، ذکاوتِ ذہن اور سرعت فہم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔'' (16)

سید صاحب کی معلومات کی وسعت دلائل کی منطق ترتیب، قدرت بیان اور سنجیدگی ومتانت نے سیرۃ عائشہ کو باغ و بہار کی طرح شگفتہ اور شاداب بنا دیا۔ ان کے اسلوب پر شبلی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کی کتابوں میں وہی جوش و جذبہ اور تحقیقی انداز ملتا ہے جو شبلی کے سوانح عمریوں کا خاصہ رہا ہے۔ جو انھوں نے تقریباً نصف صدی تک اردو ادب کی خدمت کی بقول شاہ معین الدین ندوی:

''مولانا شبلی کے کاموں کی مدت بتیس سال اور سید صاحب کی تقریباً نصف صدی اس طویل مدت میں انھوں نے گوناگوں مذہبی، علمی، اور قومی وملی وسیاسی کام انجام دیئے۔'' (17)

اس قول سے سید صاحب کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلیمان ندوی کی خدمات اردو ادب میں کتنی اہمیت کی حامل ہے اور ان کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

سید ابو الحسن علی میاں ندوی (1913-1991)

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں ایسی شخصیات جنم لیتی رہتی ہیں جو بہت ساری صفات کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں ایسی صفات اور خوبیاں جمع ہوتی ہیں جو تمام عالم کو متاثر کرتی ہیں، اور یہ شخصیات ایسے کارنامے انجام دیتی ہیں کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کے اثرات باقی رہتے ہیں۔

علی میاں ندوی بیسویں صدی کی ایسی ہی مثالی شخصیت تھی جن کو اللہ تعالی ی نے متعدد صفات و کمالات سے آراستہ و پیراستہ فرمایا تھا آپ ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ محقق و مصنف ادیب اور انشاپرداز، مورخ و مفکر اور زبردست اسکالر تھے۔ مولانا عبداللہ مغیثی صاحب فرماتے ہیں:

''آپ نے علمی صلاحیت و قابلیت، قد آور شخصیت اور قائدانہ کردار سے عالم اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت اور رہنمائی کی اور زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی جو راہ دکھائی اور تعلیمات اسلامی کو اپنے جس خاص انداز فکر، حقیقت پسندی اور اعتدال کے ساتھ پیش کیا اس پر مسلمانوں کے ہر طبقہ نے لبیک کہا اور متفقہ طور پر آپ کے انداز فکر اور خیالات و نظریات کو قبول کر کے استفادہ کیا۔ اس لیے اگر آپ کو بیسویں صدی کے ہمہ گیر شخصیت عالم اسلام کی ایک ممتاز اور بااعتماد ہستی اور ہندوستان کی ایک تاریخ ساز انسانیت نواز شخصیت قرار دیا جائے تو یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے— آپ کی گراں قدر خدمات اور مجددانہ کارنامے پوری صدی کو محیط ہیں اور ملت اسلامیہ انسانیت کے لیے وقیع خدمات کا وہ عظیم الشان ذخیرہ ہے جو رہتی دنیا تک عالم اسلام اور انسانیت نواز اقوام کے لیے مشعل راہ بنے گا۔ آپ جب اپنی خداداد علمی صلاحیت کو لے کر سند درس پر بیٹھے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زبردست اسکالر بنے اور اپنی تحقیقات النیقہ اور تخلیقات نادرہ سے ہزاروں تشنگان علوم کی پیاس بجھائی اور افراد سازی کا وہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا کہ آج آپ کے تربیت یافتہ اور مثالی شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے (اذا مات منا سید قام سید) جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے۔'' (18)

علی میاں ندوی صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ ان کی نثر اپنی انفرادیت کے لیے پہچانی جائے گی۔ وہ اپنے اسلوب بیان اور یگانہ طرز تحریر کے اعتبار سے جدید اردو نثر میں معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کا کام انجام دیا اور مختلف موضوعات پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ وہ ایک خاص مکتبۂ ادب سے منسلک رہے ہیں جس کے پیشرو علامہ شبلی علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید عبدالحئی اور مولانا عبدالسلام ندوی ہیں۔

علی میاں ندوی کی تصنیفات و تالیفات عربی، اردو، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں بہت زیادہ ہیں جن کی تفصیلات کے لیے مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام کی تازہ ترین فہرست دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ کی مؤقر کتابوں میں تاریخ دعوت وعزیمت، ارکانِ اربعہ، نقوشِ اقبال، سیرت سید احمد شہید، نبی رحمت، حیات عبدالحئی، کاروان مدینہ، المرتضیٰ، قادیانیت، انسان دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر دستور حیات، منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں مطالعہ قرآن اور اس کے اصول ومبادی، سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، پرانے چراغ، کاروانِ ایمان وعزیمت اور آپ کی خودنوشت سوانح کاروانِ زندگی قابل ذکر ہیں۔ خطباتِ مفکر اسلام 6 حصے اور مقالاتِ مفکر اسلام 2 حصے قابل دید اور لائق مطالعہ ہیں۔

نقوش اقبال— علی میاں ندوی کی علامہ اقبال سے دوسری ملاقات 22 نومبر، 1937 کو ہوئی یہ علامہ کی طویل علالت کا دور تھا تاہم وہ بڑی سرور وانبساط کے ساتھ ملے، شعر وادب سے مولانا کو خاصی دلچسپی تھی۔ اور اسی ذوق کے سبب علی میاں علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے، بچپن سے ہی اقبال آپ کے پسندیدہ شاعر رہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تقریر وتحریر میں بھی جا بجا اقبال کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس کی واضح شکل روائع اقبال (عربی) اور نقوش اقبال (اردو) میں دیکھی جاسکتی ہے، آپ نے علامہ اقبال کو پسند کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی محبت اور ایماں ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے، اور جن کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انھیں تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں یہ اسی ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ پڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر النفس وآفاق کے لیے ابھارتا ہے۔ جو مہر وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان لاتا ہے۔ میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغربی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں..... وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت اور اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔'' (19)

علی میاں ندوی کی ذہنی وفکری نشوونما میں اقبال ایک مستقل موضوع ہے۔ اقبال کے فکر وفلسفہ اور پیام حرکت و

عمل کے متعدد پہلو مولانا کی تحریروں میں نمایاں ہیں، لیکن مولانا بہت سنجیدہ قسم کے انسان ہیں اس لیے ان کے یہاں بے جا مبالغہ اور غیر متوازن جذباتیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

کاروانِ زندگی — علی میاں ندوی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ محض مولانا کے حیات کی سرگزشت ہی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ان کے عہد کی سرگذشت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

بقول ڈاکٹر نفیس حسن:

''بیسویں صدی عیسوی کی ملکی، ملی، عالمی اسلامی اور ایک حد تک بین الاقوامی حالات و واقعات کی تاریخی دستاویز کہنا زیادہ مناسب ہے۔ بالخصوص ہندوستان اور عالم اسلام کے مؤرخ کے لیے اس میں بہت کچھ سرمایہ ہے۔ یہ نہ صرف مولانا کے فکر و خیال کے تشکیلی عناصر کی تفہیم کا ایک محتاط وسیلہ ہے بلکہ ہندوستان اور عالم اسلام کے مختلف اہم واقعات و مسائل کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔'' (20)

اردو خودنوشت سوانح عمریوں میں کچھ تو مذہبیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسی سوانح عمریوں کے مصنف مذہبی لوگ رہے ہیں جنھوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں مذہب سے اپنی وابستگی کو نمایا رکھا ہے۔ دیگر کچھ خودنوشت سوانح عمریاں ان اصحاب کی نوک قلم سے نکلیں ہیں جو اپنی عام زندگی میں سیاسی یا سماجی کارکن کی حیثیت سے جانے جاتے رہے ہیں۔ ان میں انھوں نے اپنی ادبی یا شاعرانہ حیثیت کو نمایاں رکھا ہے۔

''کاروانِ زندگی'' کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خودنوشت سوانح نگاروں کے تینوں طبقوں کی پاسداری ملتی ہے۔ اس لیے اس کے مصنف کا مذہب سے بھی گہرا تعلق ہے اور اسلامی سیاست و معاشرت سے بھی اور شعر و ادب سے بھی، کاروانِ زندگی کی یہ ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام اردو خودنوشتوں یا آپ بیتیوں میں ممتاز کرتی ہے علی میاں ندوی نے ''کاروانِ زندگی'' کی پہلی جلد کے دیباچے میں لکھا ہے:

''راقم کے قلم سے عقائد و عبادات، تفسیر آیات اور سیرت طیبہ کے جیسے نازک اور پر عظمت موضوع سے لے کر تاریخ و سوانح کے مورخانہ اور ذمہ دارانہ موضوع تک معاصر شخصیتوں کے سوانحی خاکے اور ان کے بارے میں نقوش و تاثرات کے پر خار اور دشوار گزار مضمون سے لے کر شعر و ادب و فکر و فن کے جیسے لطیف مضمون تک مستقل کتابیں نکلی ہیں، جن کی تعداد درجنوں تک پہونچ گئی ہے، لیکن اس کو کسی کتاب کے شروع کرنے کے بارے میں اتنا تردد اور ذہنی کشمکش نہیں، جتنی آپ بیتی اور سرگذشت حیات (کاروان زندگی) کے شروع کرنے میں پیش آئی۔'' (21)

علی میاں ندوی مفکر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن ان کی تحریروں میں مفکرانہ خشکی کا کوئی گزر نہیں وہ حسن صلاحیت سے ادبی عبارتوں میں افکار و خیالات کا جامع مرقع پیش کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اسالیب کلام کی تین قسمیں ہیں: علمی، ادبی، خطابی۔ ہر صنف کے لیے جدا جدا انداز ہوتا ہے۔ ایک صاحب فن آدمی کا کمال ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں ایسی صفت کا مظاہرہ کرے جس سے ایک آمیزہ تیار ہو اور وہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق ہو، مولانا عبد اللہ عباس ندوی فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا کا اسلوب تحریر وتقریر ان کے سوز دروں، حمیت و غیرت اور خوش طبیعت کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی عربی یا اردو تحریر میں کوئی چبھتا ہوا فقرہ، یا ترشا ہوا لفظ، نئے طرز کا ڈھلا ہوا جملہ استعمال کرنے کے لیے مضمون نہیں لاتے، بلکہ مضمون کا بہاؤ اور خیالات و افکار کا سیل رواں جملوں میں صوتی آہنگ پیدا کرتا ہے۔'' (22)

زبان و بیان پر مکمل گرفت حضرت مولانا کی گفتگو کے اندر ایک مقناطیسی کشش رکھتی ہے۔ علی میاں چونکہ عربی کے بہترین رمز شناس تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں اور خطبات میں یہ عنصر پایا جاتا ہے۔

سیرت سید احمد شہید — یہ مولانا کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اس میں ان بندگان خدا کی تاریخ شہادت اور داستان عزیمت ہے جنھوں نے باطل کو ختم کرنے اور حق کو زندہ کرنے اور عالم انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنے خون کو نذرانہ پیش کیا۔ یہاں جواں سال مصنف کے طرز تحریر اور انداز فکر کا اندازہ لگانے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بار ہا چلے ہیں، لیکن ایمان و یقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم وتوکل، جوش جہاد، ایمان واحتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے آدم گری اور مردم سازی، اصلاح و انقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ (23)

اس تحریر کے اندر دلکشی بھی ہے اور شگفتگی بھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے اندر انتہائی درجہ کا توازن اور احتیاط ہے۔ علی میاں کی نثر میں سلاست، روانی، سادگی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر میں الجھاؤ اور ابہام کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک سادہ، رواں اور شگفتہ انداز بیان ان کی نثر کا بنیادی وصف ہے، علی میاں نے اپنی نثر میں اظہار و ابلاغ کا جو معیار قائم کیا ہے اس معیار نے ان کے اسلوب نثر میں وہ خصوصیت پیدا کر دی ہے جس سے ان کے اسلوب میں سادگی، صفائی اور تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر سلیس بھی ہے اور رنگین بھی۔

مولانا ابو الاعلی مودودی (1903-1979)

مولانا سید ابو الاعلی مودودی بیسویں صدی عیسوی کے معروف اسلامی قائد رفیع الشان مفر اور بلند پایہ مصنف تھے۔ انھوں نے تمام بندگانِ خدا تک اسلام کا سیدھا اور سچا پیغام پہنچانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اپنے اس نصب العین کو منظم انداز میں انجام دینے کے لیے ایک تحریک جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔ 1941 سے پوری یکسوئی اور دردمندی کے ساتھ اقامتِ دین کی راہ پر گامزن رہے۔ غلبۂ اسلام کی سعی و کوشش میں ان پر طرح طرح کے مصائب آئے، کئی بار جیل جانا پڑا۔ 1953 میں ''ختم نبوت'' کے تعلق سے ایک کتابچہ لکھنے کی پاداش میں ان کے لیے پھانسی کی سزا بھی تجویز ہوئی۔ لیکن کبھی بھی ان کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں پیدا ہوا، پھانسی کی سزا بعد میں عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ مولانا نے تحریک اقامتِ دین کی دعوت کو عام کرنے کے لیے 100 سے زائد کتابیں لکھیں، جن میں تفہیم القرآن (جلد اول تا جلد ششم)۔ خطبات۔ الجہاد فی الاسلام، رسالہ دینیات، تفہیمات (5 جلدوں میں)، تنقیحات، سیرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم (دو جلدوں میں) رسائل و مسائل (5 جلدوں میں)، خلافت و ملوکیت، شہادت حق، دین حق، سلامتی کا راستہ، اسلام کا نظام حیات، پردہ، حقوق الزوجین وغیرہ اہم تصنیفات سمجھی جاتی ہیں۔ اور کم و بیش چالیس زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔

مولانا مودودی کی کتاب ''پردہ'' کی اہمیت آج بھی برقرار ہے، ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہے، سلاست و روانی بھی ہے ایسی لطافت اور چاشنی بہت کم مصنفین کے یہاں ملتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں :

> ''جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقلِ عام Common Sense بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا ان مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائش زینت، یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے، جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹولیے۔ اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے

خلاف دیکھے گا تو دن دہاڑے کہہ دے گا کہ آفتاب موجود نہیں۔ البتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک Sex Appeal میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصہ اس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اگر آپ کو کسی لڑکی سے شادی کرنی ہو اور آپ اسے دیکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہتے ہوں تو سچ بتایئے کہ کیا دیکھ کر آپ فیصلہ کریں گے؟ ایک شکل اس کے دیکھنے کی یہ ہوسکتی ہے کہ چہرہ کے سوا وہ پوری کی پوری آپ کے سامنے ہو۔ دوسری یہ ہو سکتی ہے کہ ایک جھروکے میں سے وہ صرف اپنا چہرہ رکھا دے۔ بتایئے کہ دونوں شکلوں میں سے کونسی شکل کو آپ ترجیح دیں؟ سچ بتایئے کیا سارے جسم کی بہ نسبت چہرہ کا حسن آپ کی نگاہ میں اہم ترین نہیں ہے۔؟'' (24)

اسلوب کی اس سادگی میں زبان کی لطافت کے ساتھ بیان کا طریقہ کتنا نرالا ہے۔ جابجا انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جن کے استعمال سے عبارت میں مزید دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے اسلوب کے لیے حسن ادا، سادگی، اختصار اور زور بیان ناگزیر ہے۔

مولانا مودودی کی دوسری کتاب خطبات میں بھی سادہ اور سلیس نثر کا استعمال ہوا ہے۔ طرز تحریر بیانیہ ہے ایک اقتباس دیکھیں:

''روزے کے سوا دوسری جتنی عبادتیں ہیں وہ کسی نہ کسی ظاہری حرکت سے ادا کی جاتی ہیں۔ مثلاً نماز میں آدمی اٹھتا اور بیٹھتا اور رکوع اور سجدہ کرتا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حج میں لمبا سفر کر کے جاتے ہیں اور پھر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ زکوٰۃ بھی کم از کم ایک شخص دیتا ہے اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ ان سب عبادتوں کا حال چھپ نہیں سکتا۔ اگر آپ ادا کرتے ہیں تب بھی دوسروں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر ادا نہیں کرتے تب بھی لوگوں کو خبر ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف روزہ ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ نہ کھائے پیے، مگر چھپ کر پانی پی جائے، یا کچھ چوری چھپے کھا پی لے، تو خدا کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہوسکتی، ساری دنیا یہی سمجھتی رہے گی کہ وہ روزے سے ہے اور وہ حقیقت میں روزے سے نہ ہو۔'' (25)

ان کی نثر کی یہ خصوصیت ہے کہ اختصار و جامعیت کے ساتھ مفہوم کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری ہر ہر لفظ کا معنی بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ لفظی اور معنوی پیچیدگی سے پاک ہے۔ مولانا مودودی جب کسی کو دین کی دعوت دیتے

ہیں تو ان کا اسلوب بالکل بدلا ہوا ہوتا ہے۔

مولانا مودودی کی تیسری اہم کتاب 'الجہاد فی الاسلام' ہے۔ اس کی تحریروں میں بھی حسین اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ لفظوں پر گرفت عبارت کو دلنشیں بنا دیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ہر ہر قدم پر ان کے چھوٹے چھوٹے جملے متوازن فقرے خوش بیانی کی دلیل ہیں۔ بہت مختصر لفظوں میں دل کو چھونے والی بات کہنے کا فن انھیں خوب آتا ہے اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:

''انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے اس کی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اس کا خون محترم ہے۔ انسان کی تمدنی حقوق میں اولین حق زندہ رہنے کا حق ہے اور اس کے تمدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے، دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں ان سب میں احترام نفس کا یہ اخلاقی اصول ضرور موجود ہے۔ جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب و قانون بن سکتا ہے اور نہ اس کے ماتحت رہ کر کوئی انسانی جماعت پر امن زندگی بسر کر سکتی ہے، نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی عقل خود سمجھ سکتی ہے کہ اگر انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو اس کا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو، تو چار آدمی کیسے مل کر رہ سکتے ہیں، ان میں کسی طرح باہم کاروبار ہو سکتا ہے، انھیں وہ امن و اطمینان اور وہ بے خوفی و جمعیت خاطر کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے جس کی انسان کو تجارت، صنعت اور زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر و سفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے، پھر اگر ضروریات سے قطع نظر کر کے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی کسی ذاتی فائدہ کی خاطر یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر اپنے ایک بھائی کو قتل کرنا بدترین قساوت اور انتہائی سنگدلی ہے، جس کا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہونا تو درکنار۔ اس کا درجہ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔'' (26)

ارباب قلم اچھی طرح جانتے ہیں کہ قلم میں یہ روانی اور سلاست برسوں کی مشق و ممارست کے بعد کہیں جا کر پائی جاتی ہے۔ مگر مولانا مودودی کا یہ حال ہے کہ نہ کبھی اس کو مستقل فن کی حیثیت سے پڑھا اور نہ ہی اس کا اہتمام کیا بلکہ اپنی خداداد صلاحیت سے ادب کے وہ جواہر پارے بکھیرے جو آنے والوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہے مولانا مودودی کا اسلوب جہاں مذہبی نثر ہونے کے باوجود ادبی چاشنی ان کی تحریروں میں خوب پائی جا رہی ہے۔ مولانا مودودی سے متعلق ڈاکٹر ابن فرید اپنی کتاب ''ادب داد طلب'' میں لکھتے ہیں:

''ہر صاحب قلم کا اسلوب اس کے منبع علم سے ضرور متاثر ہوتا ہے، چنانچہ مغربی دارالعلوم سے فارغ شدہ حضرات جس کثرت سے انگریزی، فرانسیسی، المانی، لاطینی اور یونانی الفاظ و اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اسی کثرت سے مشرقی دارالعلوم سے فارغ شدہ علماء عربی و فارسی الفاظ و مصطلحات کی کثرت سے اپنی تحریروں کو بوجھل بنا دیتے ہیں۔ اس کی مثال اگر ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد ہیں تو دوسری طرف پروفیسر کلیم الدین احمد، مغربی تعلیم یافتہ حضرات اس ضمن میں کچھ غیر ضروری غلو سے کام لیتے ہیں۔ شاید اسی میں بظاہر احساس برتری و بہ باطن احساس کہتری کو دخل ہو، واللہ اعلم! لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اس روش سے ذہنی مرعوبیت کی غمازی ضرور ہوتی ہے۔ سید مودودی کی تحریروں میں یہ غیر ضروری یک طرفہ جھکاؤ نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں عمومی تفہیم بھی ہوتی ہے اور فطری روانی بھی، ان کا مطمح نظر چونکہ ہمیشہ دعوتِ دین رہا ہے اس لیے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ قاری کو ذہنی، فکری و جذباتی طور پر متاثر کر سکیں۔ اس لیے ان کے یہاں عبارت کی چستی اور محاورات کی عصری تازگی کا غیر محسوس اہتمام ہوتا ہے، سید مودودی کی نثر کو میں اسی وجہ سے سہل ممتنع قرار دیتا ہوں کہ وہ اپنی بات جس سادگی اور ادبی التزام سے کہہ دیتے ہیں اس سے زیادہ سادہ و پرکار انداز میں کہنا بالعموم مشکل ہوتا ہے۔'' (27)

امام احمد رضا خان (1856-1921)

انیسویں صدی میں جن ادیبوں نے اپنے علم وتفقہ، فکر وفن اور اصلاحی کارناموں سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی ان میں احمد رضا کا مقام ومرتبہ کافی بلند ہے۔ وہ علوم اسلامی کے بھی امام تھے اور سماجی مصلح کی حیثیت سے بھی وہ اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ احمد رضا نے فقہ وفتاویٰ، تفسیر وکلام اور سیر وتاریخ کے دامن میں اپنے علم وفضل کے جو انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں وہ آج بھی آبدار موتی کی طرح چمک دمک رہے ہیں اور ان سے عالم انسانیت فیضیاب ہو رہی ہے۔

احمد رضا ایک کثیر التصانیف عالم بھی تھے۔ ایک لحاظ سے دنیائے اسلام میں انھیں تصنیف وتالیف کے اعتبار سے امتیازی مقام حاصل ہے، کیونکہ ایک اندازے کے مطابق ان کی تصانیف پچاس علوم وفنون میں ایک ہزار سے زائد ہیں، اس قدر تصانیف کے علاوہ آپ نے مختلف علوم کی تقریباً اسی کتابوں پر تعلیقات وحاشیے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان سارے علمی سرمایہ کے علاوہ دو علمی وفقہی شاہکار خاص طور پر قابل ذکر اور لائق ستائش ہیں۔ ایک فتاویٰ رضویہ جس کا پورا نام ''العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ'' ہے۔ جو بارہ مجلدات پر مشتمل ہے۔ جس کی صرف پہلی جلد جہازی سائز کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے اکثر فتویٰ بجائے خود تحقیقی مقالات ورسائل کا حکم رکھتے ہیں۔ دوسرا علمی شاہکار قرآنِ مقدس کا ترجمہ ہے جس کا نام ''کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن'' ہے۔

فتاویٰ رضویہ کا مقام زبان وبیان اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے انتہائی وقیع اور عظیم الشان ہے۔ بلا شبہ اس مجموعۂ فتاویٰ کے حوالہ سے لسانی خصوصیات اور طرز ادا کی روشنی میں احمد رضا کی ادبی خدمات کو اگر حیطۂ تحریر میں لایا جائے تو اک ضخیم اور مبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ جو اردو زبان وادب کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ ہوگی۔

پاکستان کے مشہور محقق سید ریاست علی قادری احمد رضا کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر ادیبانہ اسلوب، نگارش اختیار کرنے پر کتنی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی ادبی خدمات سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک کہنہ مشق ادیب اور بے باک قلم کار تھے۔ اُن کی تحریروں میں بے حد سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان میں جگہ جگہ ادبی شہ پارے نظر آتے ہیں کہ طبیعت جھوم جھوم اٹھتی ہے۔'' (28)

فتاویٰ رضویہ کے بہت سے دل نشیں فتاویٰ زبان وبیان کی حیثیت اور طرز اسلوب کے لحاظ سے جاذب فکر ونظر ہیں۔ ان کا حسین انداز بیان، زبان کی سلاست، برمحل شیریں وادبی الفاظ کا استعمال استعارات کی جودت، طرز ادا

میں نفاست و شستگی ادائیگی بیان میں مہارت و پختگی، فکر وخیال میں گہرائی و گیرائی، اظہار بیان میں بے ساختگی و بے تکلفی ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ احمد رضا قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے ان کو نفس موضوع اور بندشِ الفاظ پر ایسی قدرت تھی کہ ایک دفعہ کے لکھے ہوئے جملے کو قلم زد کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ انتہائی سریع التحریر قلم کار تھے۔ ان کی بے ساختہ اور بے تکلف تحریروں میں بھی ادبی حسن و جمال کی رعنائیاں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ ادب کی اہم خوبی اور اسلوب کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں حل کر دیئے جائیں۔

فتویٰ رضویہ میں سب سی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں احمد رضا نے زندگی کے اہم سے اہم مسائل کو اس طرح نپے تلے دوٹوک جملوں میں حل کر دیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ فتاویٰ رضویہ گیارہویں جلد میں لکھتے ہیں:

''جو شخص نبوت کو کہے کہ کسبی ہے کافر ہے، اور جو ولایت کو کسبی کہے بد مذہب ہے، کوئی شخص کیسا ہی عمل کرے اپنے عمل کے سبب ابتدائی درجۂ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا۔'' (29)

فتاویٰ رضویہ کی عبارتیں اس قدر مربوط اور منظم ہیں کہ ان میں ایک حرف کے گھٹانے اور اس اسلوب میں بڑھانے کی گنجائش نہیں۔ انتہائی جامع اور حشو و زائد سے محفوظ اور شوکت الفاظ سے معمور اس مجموعہ فتاویٰ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے:

''زن وشوہر میں ہر ایک کے دوسرے پر حقوقِ کثیرہ واجب ہیں ان میں جو بجا نہ لائے گا اپنے گناہ میں گرفتار ہوگا۔ ایک اگر ادائے حق نہ کرے تو دوسرا اسے دستاویز بنا کر اس کے حق ساقط نہیں کر سکتا۔ مگر وہ حقوق کہ دوسرے کے کسی حق پر مبنی ہوں اگر یہ اس کا ایسا حق ترک کرے، وہ دوسرا اس کے یہ حقوق کہ اس پر مبنی تھے ترک کر سکتا ہے۔ جیسے عورت کا نان ونفقہ کہ شوہر کے یہاں پابند رہنے کا بدلہ ہے اگر ناحق اس کے یہاں سے چلی جائے جب تک واپس نہ آئے گی کچھ نہ پائے گی۔ غرض واجب ہونے، مطالبہ ہونے، بے وجہ شرعی ادا نہ کرنے سے گنہ گار ہونے میں تو حقوق زن وشوہر برابر ہیں۔ ہاں! شوہر کے حقوق عورت پر بہ کثرت ہیں۔'' (30)

امام احمد رضا جو صرف ایک ادیب ہی نہیں بلکہ محدث، مفسر، فقیہہ، متکلم اور منطقی بھی تھے۔ بلکہ سیاستی بصیرت بھی خوب رکھتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ کہاں؟ کب؟ کس طرح کی عبارت؟ کیسا اسلوب؟ استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اردو زبان پر قدرت اور ان کی موزوں طبیعت نے انھیں یہ صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ موضوع کے مطابق اسلوب کا استعمال کر سکتے تھے، کیوں کہ ہر موضوع ایک خاص اسلوب چاہتا ہے۔ تحقیقی مباحث کے لیے جو اسلوب مناسب ہوگا، تنقید اور جواب کے لیے وہ اسلوب موزوں نہیں ہوگا۔ فتویٰ کے لیے جو اسلوب درکار ہے دعوتی خطوط

کے لیے وہ اسلوب مناسب نہیں ہوگا۔ اس لیے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ ان کا انداز بیان ہر ایک میں مختلف ہے لیکن ان کی تمام تحریریں ادبی چاشنی، بیان کی لطافت، الفاظ کی بندش اور حسین پیرایۂ بیان سے مملو ہیں۔ ان کو زبان پر اس قدر عبور تھا کہ خواہ کسی بھی موضوع پر وہ لکھ رہے ہوں، موقع و محل کے لحاظ سے ایسی چست اور دلنشیں زبان استعمال کرتے ہیں کہ لگتا ہے الفاظ و صفات قطار در قطار آپ کے قلم کی جولانی کے آگے انتظار میں کھڑے ہیں اور احمد رضا ان میں سے چن چن کر نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے مضمون میں ان کا انتخاب کرتے جا رہے ہیں۔ درج ذیل تحریر میں سلاست و روانی کے ساتھ استعمال محاورات کی بہار دیکھیں:

''جب بفضل اللہ تعالیٰ ان کے زور بازو نے دین الٰہی کی بنیاد مستحکم کر دی اور مشارق و مغارب میں ملت حنفیہ کی جڑ جم گئی اس وقت ائمہ و علمائے مابعد نے تخت و بخت سازگار پا کر بیخ و بن جمانے والوں کی ہمت بلند کے قدم لیے اور باغبان حقیقی کے فضل پر تکیہ کر کے اہم الا ہم کاموں میں مشغول ہوئے۔ اب تو بے خلش صرصر و اندیشہ سموم اور ہی آبیاریاں ہونے لگیں۔ فکر صائب نے زمین تدقیق میں نہریں کھودیں۔ ذہن رواں نے زلال تحقیق کی ندیاں بہائیں۔ علماء اولیا کی آنکھیں ان پاک مبارک نونہالوں کے لیے تھالے بنیں۔ خواہان دین و ملت کی نسیم انفاس متبرکہ نے عطر بیزیاں فرمائیں۔ یہاں تک کہ مصطفےٰ کا باغ ہرا بھرا پھولا پھلا لہلہایا۔ اور اس کے بھینے پھولوں، سہانے پتوں نے چشم و کام و دماغ پر عجب ناز سے احسان فرمایا۔ والحمد اللہ رب العالمین۔ اب اگر کوئی جاہل اعتراض کرے کہ یہ کنچھیاں جواب پھوٹیں جب کہاں تھیں؟ یہ پتیاں جواب نکلیں پہلے کیوں نہاں تھیں؟ یہ پتلی پتلی ڈالیاں جواب جھومتی ہیں نو پیدا ہیں۔ یہ ننھی ننھی کمیاں جواب مہکتی ہیں تازہ جلوہ نما ہیں۔ اگر ان میں کوئی خوبی پاتے تو اگلے کیوں چھوڑ جاتے؟ اس کی حماقت پر اس الٰہی باغ کا ایک ایک پھول قہقہہ لگائے گا کہ او جاہل! اگلوں کو جڑ جمانے کی فکر تھی وہ فرصت پاتے تو یہ سب کچھ کر دکھاتے آخر اس سفاہت کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ نادان اس باغ کے پھل پھول سے محروم رہے گا۔'' (31)

اس اسلوب میں شگفتگی بھی ہے سلاست و روانی بھی ہے۔ ایسی لطافت اور چاشنی بہت کم مصنفین کے یہاں ملتی ہے۔ یہی اسلوب کہیں چل کر بالکل بدل جاتا ہے۔ عبارت کی رنگینی اور ساخت میں نمایاں فرق آجاتا ہے۔ عبارت بالکل سادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک رسالہ میں ارقام فرماتے ہیں:

''یہ بات اسی سے صادر ہوگی جو تقدیر کو بھول کر تدبیر پر اعتماد کر بیٹھا شیطان اسے ابھارتا ہے۔ اگر یہ بن پڑی جب تو کار برآری ہے ورنہ مایوسی و ناکامی۔ ناچار سب ایں و آں سے غافل کر کے لہو پانی

ایک کر دیتا ہے اور خوشا و چاپلوسی مکر و دغا بازی جس طرح بن پڑے اس کی راہ لیتا ہے۔ حالانکہ اس حرص سے کچھ نہ ہوگا۔" (32)

اسلوب کی اس سادگی میں زبان کی لطافت کے ساتھ بیان کا طریقہ کتنا نرالا ہے۔ مترادفات اور محاورات کے استعمال سے عبارت میں مزید دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسے اسلوب کے لیے حسن ادا، سادگی، اختصار، زور بیان ناگزیر ہے۔ احمد رضا کی تحریروں میں لفظوں پر گرفت عبارت کو دلنشیں بنا دیتی ہے۔ ان کو اردو زبان پر جو قدرت حاصل تھی اور زبان کی چاشنی، بیان کی شگفتگی کا جو وہ ملکہ رکھتے تھے بڑے بڑے نامور ادیبوں میں وہ عنقا ہے۔

اردو نثر میں ابتدا سے ہی اسلام سے متعلق جو سرمایہ عالمِ وجود میں آتا رہا ہے وہ نا قابل فراموش ہے۔ اور اتنے بڑے سرمائے کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اردو کے بارے میں ایک دعویٰ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں اسلام سے متعلق جس قدر سرمایہ موجود ہے اتنا کسی اور زبان میں، حد یہ ہے کہ عربی اور فارسی زبان میں بھی نہیں ہے۔ اور یہ دعویٰ بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ یہ اس زبان کے استعمال کرنے والوں کے ذہنی و فکری رجحان کی نمایاں غمازی بھی ہے، ایسا اس وجہ سے ہے کہ اردو نثر کے تشکیلی دور سے ہی اس کے سامنے ایک تعمیری نصب العین رہا ہے۔ اور اس نے اپنے ہر ارتقائی دور میں بڑے وسیع پیمانے پر تعمیری خدمات انجام دی ہیں۔

اردو نثر کا مرکزی موضوع نمایاں اور مخصوص طور پر تعمیری رہا ہے، کلاسیکی تصانیف خواہ تبلیغ دین کے لیے ہوں یا صوفیائے کرام کے ملفوظات ہوں یا اہم تحریکی و مقصدی تصانیف ہوں، جیسے سرسید کی تحریریں یا حالی و شبلی کی تحریریں، یا سید احمد شہید کی تحریریں یا دیوبند کے علماء کی تحریریں ان سب کے پیش نظر ایک واضح تعمیر بھی ہے اور زندگی کی صورت گری کے لیے انھوں نے کچھ مثبت پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی ہے جن کے تجزیہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ایک تعمیری نصب العین کو اہمیت دی ہے۔

جدید اردو نثر میں عقیدہ، اقدار اور ملی ورثہ کے سیاق میں جس ذہن و فکر کی تشکیل ہوئی ہے وہ صاحب طرز نثر نگاروں کے باطن میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اظہار مدعا میں نہ صرف کسی طرح تکلف نہیں ہوتا بلکہ بیان خود ایک اسلوب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً حالی کی نثر کی سادگی اور استدلال کی بے ساختگی، شبلی کی نثر میں نثری آہنگ اور تخلیل کے لیے امکانات کی دعوت۔

ابوالکلام آزاد کی خطابت و علمیت کے امتزاج سے اردو نثر کو بلند آہنگی عطا کرنے کی سعی جس نے عربی و فارسی محاورات و استعارات کو اردو نثر کا جز بنا دینا چاہا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور نام کا اضافہ کر لیجیے۔ سید مودودی کی "تفہیم القرآن" کی نثر ہماری صدی میں اردو نثر میں عہد ساز اضافہ ہے۔ اس نثر کی روایت سرسید اور حالی سے ملتی ہے۔ سید

مودودی کے پیش نظر تفہیم وتبلیغ رہی ہے۔ چنانچہ اپنی زبان کو انھوں نے زیادہ سے زیادہ ترسیلی تبلیغی اور تفہیمی بنانے کی کوشش کی ہے۔

عصرِ حاضر میں سید ابوالحسن علی ندوی کی نثر اپنی انفرادیت کے لیے پہچانی جائے گی۔ وہ ایک خاص مکتبۂ ادب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے پیشرو علامہ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی رہے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی بہت محتاط عالم تھے اسی وجہ سے وہ اپنی بات کو پیش کرتے ہوئے قلکاری سے کام نہیں لیتے تھے۔

علی میاں ندوی اس منطقی و استدلالی اسلوب سے بڑی حد تک متاثر ہیں لیکن چونکہ وہ خود عربی کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں اس لیے ان کے یہاں اپنے پیش رو ندوی علماء سے مختلف اسلوب ملتا ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ ادیب کے ساتھ خطیب بھی نظر آتے ہیں۔ اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے علی میاں ندوی اپنے عہد کے صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کی معرکۃ آلا راء تصنیف جو اردو نثر میں ہمیشہ سنگ میل کی حیثیت رکھے گی، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' ہے۔ مذہبی نثر کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ سرمایہ اتنا وافر اور بیش قیمت ہے کہ اس نے اردو کو ایک تہذیب عطا کر دی ہے۔

اردو نثر کے مثالی نمونے مذہبی کتب و ملفوظات ہی میں ہیں اور نثر کو اولاً وسیلۂ تبلیغ و ابلاغ بنانے والی دینی تصنیفات ہی ہیں، کیونکہ نثر کی سنجیدہ ضرورت دعوتِ دین ہی کو محسوس ہوئی دوسرے علوم اور لطیف ادب کے لیے اردو نثر کا استعمال صرف انیسویں صدی میں کیا گیا۔ اس سے قبل اس کی افادیت و اہمیت کو لائقِ اعتنا تصور نہیں کیا گیا۔ نثری دینی تحریروں میں زبان کے جس معیار کو مدِ نظر رکھا گیا اور اس میں جس نوعیت کے پر ندرت تجربات اب تک کیے جاتے رہے اور کیے جا رہے ہیں وہ عام نثر میں اب بھی خال خال ہیں۔

حواشی:

1۔رئیس القلم نمبر۔ص۔105۔مکتبہ جام نور، دہلی۔ 2002

2۔رئیس القلم نمبر۔ص۔106۔مکتبہ جام نور، دہلی۔ 2002

3۔شہاب ظفر اعظمی۔اردو کے نثری اسالیب۔ص۔24-23۔تخلیق کار پبلسر، دہلی۔1999

4۔شہاب ظفر اعظمی۔اردو کے نثری اسالیب۔ص۔27-26۔تخلیق کار پبلسر، دہلی۔1999

5۔شہاب ظفر اعظمی۔اردو کے نثری اسالیب۔ص۔26۔تخلیق کار پبلسر، دہلی۔1999

6۔امیر اللہ خان شاہین۔اردو اسالیب نثر۔ص۔227۔جمال پرنٹنگ پریس، نئی دہلی۔1977

7۔امیر اللہ خان شاہین۔اردو اسالیب نثر۔ص۔229۔جمال پرنٹنگ پریس، نئی دہلی۔1977

8۔شبلی نعمانی۔سیرت النبی (جلد اول)۔ص۔21-120۔ .....

9۔شبلی نعمانی۔الفاروق، (حصہ دوم)۔ص۔47۔شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔1993

10۔شبلی نعمانی۔شعر العجم (جلد چہارم)۔ص۔177۔مطبع معارف، اعظم گڑھ۔1999

11۔عبدالمغنی۔ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش۔ص۔26-25۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۔1991

12۔سید سلیمان ندوی۔حیات شبلی۔ص۔1۔شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔1985

13۔معارف۔ص۔6۔جولائی۔1950

14۔عبدالماجد دریابادی۔مرتب۔مکتوبات سلیمان (جلد اول) ص۔8۔شاہی پریس۔لکھنؤ۔1963

15۔سید سلیمان ندوی۔سیرت النبی (جلد پنجم) ص۔53۔شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

16۔سید سلیمان ندوی۔سیرت عائشہ ص۔9-8۔شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

17۔شاہ معین الدین ندوی۔حیات سلیمان۔ص۔4، معارف پریس۔اعظم گڑھ۔1971

18۔سید ابوالحسن ندوی۔کاروان زندگی (حصہ اول) ص۔45-144، مکتبہ اسلام۔لکھنؤ۔2001

19۔سید ابوالحسن ندوی۔نقوش اقبال۔ص۔34، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔1976

20۔محمد نفیس حسن۔میری تمام سرگذشت۔ص۔57، دریا گنج، دہلی۔2000

21۔اس کے علاوہ کچھ خودنوشت سوانح عمریاں وہی ہیں جو شاعروں اور ادیبوں میں رقم کی ہیں۔

22۔مفکر اسلام نمبر۔عالمی سہارا۔ص۔46، دہلی۔2007

23۔سید ابوالحسن ندوی۔سیرت سید احمد شہید۔ص۔23، مکتبہ اسلام۔لکھنؤ۔2001

باب سوم

ارشد القادری کا اسلوب

(لالہ زار کے حوالے سے)

ارشد القادری کا اسلوب

(لالہ زار کے حوالے سے)

ارشد القادری کی کتاب ''لالہ زار'' سترہ (17) اسلامی کہانیوں پر مشتمل ہے، جس کی اشاعت 14 اپریل، 1986 میں ہوئی تھی، ان میں ایسی کہانیاں شامل ہیں جن سے عبرت و نصیحت حاصل ہو یا خیر و سعادت کی ترغیب ملتی ہو، کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جو بالکل سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ جیسے۔ ''ایک برہمن دوشیزہ'' کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن میں اسلامی تاریخی واقعات بیان کئے گیے ہیں۔ جیسے۔ ''تاراج کارواں۔''

ارشد القادری لالہ زار کی اہمیت و افادیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''جس زمانے میں کلکتہ سے میں 'جام کوثر' اور 'جام نور' نکالتا تھا۔ ہر شمارے میں مستقل عنوانات کے تحت بزبان حکایات کا ایک عنوان بھی لازماً ہوا کرتا تھا، اپنے قارئین کے ذوق مطالعہ اور ذہنی رجحانات کے ذریعے میں نے بار بار اس امر کا مشاہدہ کیا کہ درس و تدریس کے انداز میں جو باتیں کہی گئیں ان کے حلق کے نیچے اترنے میں دیر لگی۔ لیکن وہی باتیں جب قصص و حکایت کے پیرائے میں بیان کی گئیں تو انھیں طبیعتوں نے جلد قبول کر لیا۔'' (1)

ارشد القادری لالہ زار کی واقعات نگاری کے بنیادی مقصد کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جام نور میں ان تاریخی کہانیوں کی اشاعت سے میرے دو مقاصد تھے، پہلا مقصد تو یہ تھا کہ ہاتھوں میں ایمان افروز، روح پرور اور پاکیزہ کہانیوں کا لٹریچر دے کر ان نوجوانوں کا ذہن بدلا جائے جو گندے ناولوں اور شہوت انگیز افسانوں کو پڑھ کر اپنا وقت بھی برباد کرتے اور اپنی قیمتی صلاحیت بھی اور زندگی غلط رخ پر لگ جانے کے بعد مستقبل کی تباہی کا جو بھیانک انجام ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ جن مسلمانوں کو دینی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ اپنی بد ذوقی کی وجہ سے مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے محروم ہیں۔ انھیں حکایات کی زبان میں دین سے روشناس کرایا جائے۔ خدا کا شکر ہے مجھے اپنے دونوں مقاصد میں توقع سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی دفتر میں موصول شدہ اطلاعات کے مطابق ہمیں یہ معلوم کر کے غایت درجہ مسرت ہوئی کہ 'جام نور' کی تاریخی

کہانیوں کو پڑھ کر بہت سے نوجوانوں کا مزاج بدل گیا۔ روحوں میں طہارت و پاکیزگی کی طرف بڑھنے کی جستجو پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ عشق و ایمان کے سوز و گداز نے ان میں سے کچھ لوگوں کو اندر سے اتنا بدل دیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گیے۔'' (2)

جب ان قصے اور کہانیوں کی مقبولیت عوام میں بڑھی اور لوگوں کے پیہم اصرار پر ارشد القادری نے ان کہانیوں کو یکجا کر کے لالہ زار کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس سلسلے میں ارشد القادری خود لکھتے ہیں:

''جام نور کی ان تاریخی کہانیوں کو نئے سج دھج کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے ہم خوشی محسوس کر رہے ہیں اور مذہبی جذبہ رکھنے والے مسلمانوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ بگڑے ہوئے نوجوانوں کے ہاتھوں میں اس کتاب کو پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ پچھلے تجربات کی روشنی میں مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نوجوانوں کے جذبات و احساسات کو پاکیزگی عطا کرے گی۔ اور ان کے دلوں میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق اور بزرگانِ دین کی عقیدت کا نور پیدا کرے گی، خیر و سعادت کہ سلسلہ میں اصل مرحلہ دل کی آمادگی کا ہے۔ دل اگر سنور گیا تو عمل کے میدان میں پیش قدمی کے لیے کسی بیرونی ترغیب کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' (3)

لالہ زار کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلم نوجوان کے سامنے ایک صاف ستھرا اسلامی لٹریچر پیش کیا جائے۔ مولانا عبدالرحمٰن فیضی لالہ زار کے متعلق لکھتے ہیں:

''لالہ زار کہانیوں کے پیرائے میں عشق و ایمان کے جذبات کو جگا دینے والی کتاب جس کو پڑھنے کے بعد ہر مومن کا قلب جھوم جاتا ہے۔ بار بار پڑھنے کے بعد بھی طبیعت نہیں اکتاتی۔ الفاظ کی سجاوٹ اور خوبصورت جملے دیکھنے کے بعد علامہ صاحب کی ادیبانہ صلاحیتوں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔'' (4)

مولانا عبدالسلام رضوی ایک خط کے ذریعہ ارشد القادری سے لالہ زار میں شامل کہانیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں:

''لیکن ان کا ماخذ و مرجع مذکور نہ ہونے کی وجہ سے بعض واقعات (مثلاً سوداگر کی بیٹی، دل کا یقین، چودھویں رات کی دوشیزہ) کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعات حقیقی نہیں بلکہ فرضی ہیں جو عبرت و نصیحت کے لیے لکھے گیے ہیں۔ اور ان کی حیثیت طبع زاد ناولوں کی سی ہے۔ حالانکہ ان کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات حقیقی ہیں، لہذا اگر ان واقعات کا ماخذ و مرجع بھی ذکر کر دیا جائے تو بہتر ہو۔'' (5)

ارشد القادری خط کے جواب میں لالہ زار کے بارے میں بالکل تفصیل سے لکھتے ہوئے اس کی وضاحت کرتے ہیں:

''لالہ زار'' نام کی کتاب حکایت کی زبان میں جذبہ و احساس کی تطہیر کے لیے لکھی گئی ہے۔ وہ امثال و قصص کی کتاب ہے فقہ کی کتاب نہیں جس کی صحت کے لیے ماخذ کی صحت ضروری ہو، آخر مرشد رومی کی مثنوی، نظامی گنجوی کی تحفۃ الاحرار، سعدی کی گلستاں بوستاں اور فرید الدین عطار کی منطق الطیر میں جتنے قصص و حکایات بیان کیے گیے ہیں ان کا سلسلۂ سند کس کے پاس ہے، پھر کیا اس بنیاد پر انھیں ناول کہا جا سکتا ہے؟ جو لوگ ''لالہ زار'' پر ناول ہونے کا طنز کرتے ہیں انھیں پہلے ناول کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ ناول کی مذمت اس لیے نہیں کی جاتی ہے کہ وہ فرضی کہانیوں پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ مذمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے مواد پر مشتمل ہوتی ہے جو شہوانی جذبات میں ہیجان برپا کر کے قاری کے اندر گناہ کی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ ناول کے اس مفہوم کو نظر میں رکھ کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ کیا ''لالہ زار'' پڑھنے کے بعد بھی قاری کے اندر اس طرح کے ناپاک جذبات کی تحریک ہوتی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ جو کتاب نوجوانوں کو ناول کی لعنت سے بچانے کے لیے لکھی گئی ہے، اس پر ناول ہونے کا طنز کیا جاتا ہے۔ لالہ زار میں جتنے قصص و حکایات درج کیے گیے ہیں ان کا ماخذ صرف اتنا ہی ہے کہ چھوٹا سا عبرت آموز واقعہ اپنے ثقہ علما کی زبانی سنا اور اپنے انداز میں اسے پھیلا دیا۔ اس کتاب کو اس نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیے کہ قاری کے جذبۂ احساس پر اس کا پاکیزہ اثر کیا پڑتا ہے۔''(6)

ارشد القادری جہاں دیگر علوم وفنون پر عبور رکھتے تھے وہیں اردو ادب کے ایک ماہر ادیب بھی تھے۔ ان کی اردو تصانیف اس بات پر گواہ ہیں۔ چونکہ بحث ان کے نثری اسلوب سے ہونی ہے اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلوب کسے کہتے ہیں؟ اسلوب کے لغوی معنی طرز اور پیرایہ کے ہیں۔ اصطلاح میں اسلوب کسی ادیب کے انفرادی انداز بیان یا طرز اظہار کو کہتے ہیں، جو اس ادیب کی پہچان بن جاتی ہے۔ ارباب علم وادب نے اسلوب کی کئی قسمیں بیان کی ہیں جیسے سادہ اسلوب، شگفتہ اسلوب، مرصع اسلوب، طنزیہ اسلوب، مخلوط اسلوب، محاوراتی اسلوب پر شکوہ اسلوب وغیرہ۔

کہانی کے اجزائے ترکیبی میں اسلوب ایک اہم جزو ہے۔ ہر فنکار کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو اسے دوسرے فنکاروں سے الگ کرتا ہے۔ کسی فنکار کی انفرادیت کو پہچاننے پرکھنے یا یہ پتہ لگانے کے لیے کہ اس میں انفرادیت

ہے بھی یا نہیں۔ اس کے اسلوب کا جائزہ لیا جاتا ہے اور کسی فن پارہ کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے اس کے اسلوب کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ اسلوب محض موضوع کی زیب و زینت یا آرائش نہیں بلکہ ایک وسیلہ ہے جو موضوع یا مضمون کو فن میں تبدیل کرتا ہے اسی لیے ایک فنکار کے لیے طریقۂ اظہار سے واقف ہونا اور اظہار کے مختلف پیرایوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ فنی صلاحیت جو کہیں تو خدا داد ہوتی ہے اور کہیں اکتساب کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔

بقول وقار عظیم:—

''مشاہدہ افسانہ نگار کی ذہنی اور جذباتی تعمیر کا ایک قیمتی جزو ہے، مشاہدہ فنکار کا پہلا اسلحہ ہے اور تجربہ دوسرا۔ مطالعہ اس کے لیے معلومات کے خزانہ کا منہ کھول دیتا ہے، ذہن میں تخلیقی قوتوں کو ابھارتا اور خیالات میں ایک نئی تازگی و توانائی پیدا کرتا ہے، جس کے سہارے فنکار اپنے طور پر نئی بہترین چیزوں کی تخلیق کر سکتا ہے۔'' (7)

بیانِ قصہ کے کئی طریقے ہیں۔ کچھ کہانیوں میں فنکار واحد غائب اور واحد متکلم کے صیغوں کا استعمال کرتے ہیں، کچھ افسانے خطوط اور ڈائری کے اوراق پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کبھی منظر نگاری پر زور دے کر اس کے پس منظر میں کردار کی شخصیت پر زور دیا جاتا ہے، کہیں مکالموں کے ذریعہ قصہ بیان کیا جاتا ہے، کہیں مزاح کا رنگ غالب نظر آتا ہے تو کہیں ہجو یہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ انداز بیان فنکار کی ذہانت و ذکاوت اور زبان پر اس کی قدرت کا ثبوت ہے۔

تحریر میں سوز و گداز اسلوب کا اہم جزو ہے جو قاری کے دل میں ہمدردی اور رحم کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ سادگی اور اختصار بھی لازمی اجزاء مانے جاتے ہیں جو عبارت میں حسن و متانت پیدا کرتے ہیں۔ اختصار کے لیے ایمائی اور رمزیہ طرز اپنایا جاتا ہے۔ خیال افروزی بھی اسلوب کا ایک وصف ہے۔ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو معنی سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان تہہ دار الفاظ کے ساتھ کچھ خیالات اور افکار بھی آتے چلے جاتے ہیں جن سے نئے خیالات اور افکار پیدا ہوتے ہیں جو قاری کو محو کر دیتے ہیں۔

فنکار کے لیے اچھا انشاء پرداز ہونا بھی ضروری ہے۔ موضوع کتنا ہی دلچسپ ہو اس کی ترتیب کتنی ہی فنی ہو، لیکن اگر اظہار کے لیے مناسب زبان کا استعمال نہ کیا جائے تو اپنے تمام تر تکنیکی و فنی محاسن کے باوجود کہانی شاہکار یا کامیاب تخلیق کا درجہ نہیں پا سکتی، فنکار کو انھیں الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کرنا چاہیے جو صحیح معنی پر دلالت کرتے ہوں اور جو خیالات کی صحیح ترجمانی کریں۔ دراصل زبان ایک شفاف شیشہ ہے جس میں سے قاری انسانی زندگی کا

نظارہ کرتا ہے۔ اس لیے مصنف کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس شیشے کو صاف رکھے تا کہ زندگی دھندلی نظر نہ آئے۔ اسلوبیات کا زبان شناسی سے گہرا تعلق ہے۔

غرض ایک اچھا اسلوب اپنے اندر سحر کی سی تاثیر اور مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور قاری کے ذہن پر دیر پا تاثر چھوڑتا ہے، نیز فنکار کو حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔

چونکہ عام طور پر ادیب زمانے کا نبض شناس اور عوام کی بہ نسبت کہیں زیادہ حساس اور باریک بین ہوتا ہے، اس لیے سماج کے دوسرے افراد کے مقابلے میں بہت جلد بدلتے ہوئے حالات کو سمجھ لیتا ہے اور وہ جس عہد میں جیتا ہے اس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی و تہذیبی حالات کے نشیب و فراز سے برسر پیکار ہو کر اس نئے پیدا ہونے والے مسائل سے نہ صرف موضوعات کا انتخاب کرتا ہے بلکہ ان موضوعات کو پیش کرنے میں اس فن اور تکنیک کا بھی سہارا لیتا ہے جو زمانے کو درکار ہوتی ہے۔

ارشد القادری جو صرف ایک ادیب ہی نہیں بلکہ محدث، مفسر، فقیہ، متکلم اور منطقی بھی تھے بلکہ سیاسی بصیرت بھی خوب رکھتے تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ کہاں؟ کب؟ کس طرح کی عبارت کیسا اسلوب استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اردو زبان پر قدرت اور ان کی موزوں طبیعت نے انھیں یہ صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ موضوع کے مطابق اسلوب کا استعمال کر سکتے تھے کیوں کہ ہر موضوع ایک خاص اسلوب چاہتا ہے۔ تحقیقی مباحث کے لیے جو اسلوب مناسب ہوگا تنقید اور جواب کے لیے وہ اسلوب موزوں نہیں ہوگا۔ فتویٰ کے لیے جو اسلوب درکار ہے دعوتی خطوط کے لیے وہ اسلوب مناسب نہیں ہوگا، اس لیے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ ان کا انداز بیان ہر ایک میں مختلف ہے۔ لیکن ان کی تمام تحریریں ادبی چاشنی، بیان کی لطافت الفاظ کی بندش اور حسین پیرائے بیان سے مملو ہیں۔

علامہ بدر القادری صاحب، ارشد القادری کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ارشد القادری تفہیم مضامین میں اردو کے مذہبی ادب کے اندر ایک اچھوتے انداز بیان اور جدید اسلوب تنقید کے بانی ہیں۔ کاش انھیں اپنے اسی مخصوص طرز انشاء میں کام کرنے کے لیے وقت مزید اجازت دیتا تو دنیا دیکھتی کہ مذہبی زبان و ادب کو انھوں نے کن قیمتی خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔'' (8)

ممتاز شیریں اپنے ایک مضمون میں کہانیوں سے متعلق لکھتی ہیں:

> ''دو کہانیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ دو طریقے ایک سے نہیں ہوتے۔ کہانیاں، جو مختصر قصوں کی طرح

ہوتی ہیں، کہانیاں، جن میں عمل، ردعمل اور عروج یکے بعد دیگرے آتے ہیں، کہانیاں جن میں افسانہ نگار کہیں دور بلندی سے زندگی کا جائزہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کہانیاں، جو ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ بس زندگی سے تراش کر رکھ دی گئی ہوں اور فن کار کاٹے ہوئے ٹکڑے کے کنارے تک گھس کر صاف نہ کیے ہوں، کہانیاں جو مجازی یا رمزی ہوتی ہیں، کہانیاں جو صرف تصویری ہوتی ہیں، کہانیاں جن میں سوچتا ہوا ذہن دکھایا جاتا ہے کہانیاں جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتی ہیں: کہانیاں، جو محض رپورتاژ کے ٹکڑے ہیں۔ ان گنت کہانیاں ہیں اور ان گنت تکنیکیں۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو فن کار اسے من وعن بیان نہیں کرتا بلکہ مشاہدے کے بعد پیش کرنے کے انداز کے متعلق سوچتا ہے اور یہیں حقیقت اور تخیل ہم آغوش ہوتے ہیں۔ موضوع اور تکنیک دونوں اہم ہیں لیکن تکنیک مواد کی غلام ہے۔ مواد تکنیک کا نہیں۔ الزبتھ بون کہتی ہیں: ''کہانی کے لیے ایک اثر چاہیے جو لکھنے والا شدت سے محسوس کرے اور اس پر لکھنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ اس کے بعد نہایت سوچ اور محنت سے اسلوب شناخت کرے۔ افسانے کی تعمیر میں تکنیک ایک بڑا ضروری جزو ہے لیکن مکمل اور خوبصورت چیز اسی وقت تیار ہوگی جب مواد اچھا ہو، اسلوب تحریر اور بیان اچھا ہو۔ فن کار ان سب کو اچھی طرح گوندھے کہ یہ ہم آہنگ ہو جائیں اور اسے صناعی اور چابک دستی سے ڈھال کر ایسی مکمل اور خوبصورت شکل دے کہ مواد اور ہیئت میں کوئی فرق نظر نہ آئے اور ہم پڑھ کر یہ نہ کہیں کہ اس افسانے کا مواد یا تکنیک اچھی ہے بلکہ یہ کہہ اٹھیں: ''یہ افسانہ اچھا ہے!'' (9)

اردو میں بھی بہت عرصے سے کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں اچھی بھی ہیں، بہت اچھی بھی معمولی بھی۔ بے کار اور فضول بھی۔ مگر پھر بھی اچھی کہانیاں اور اچھے لکھنے والوں کی کمی نہیں۔

کہانی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فن کار کے دماغ سے نکلے اور قاری کے دل میں اتر جائے کہ کہانی ملکوں کو نہیں دلوں کو فتح کرتی ہے۔ یہی اس کا مقصد، اس کی کامیابی اور اس کی معراج ہے۔

ناقدین نے اردو نثر کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ توضیحی نثر، بیانیہ نثر، تاثراتی نثر اور شخصی یا انا نیتی نثر۔

لالہ زار میں ان تمام نثر کی جھلک جا بجا مل جاتی ہے خاص کر بیانیہ نثر کی، جس کی نشاندہی ہم ان کی کہانیوں کے ذریعے کر سکتے ہیں۔

جلوۂ زیبا

لالہ زار میں شامل کہانیوں میں یہ پہلی کہانی ہے۔ اس کہانی کا تعلق لکھنؤ کی سرزمین سے ہے۔ اس کہانی کے دو مرکزی کردار ہیں، ایک انگریز کمشنر کی صاحبزادی جو بعد میں اسلام قبول کر لیتی ہے اور اپنا نام فاطمہ رکھ لیتی ہے دوسرا کردار لکھنؤ کے مشہور فارسی داں ملاّ سراج الدین کی ہے۔ لکھنؤ میں ایک نئے انگریز کمشنر کی بحالی ہوتی ہے، چونکہ اس وقت کی دفتری زبان فارسی تھی اس لیے کمشنر کو فارسی زبان سیکھنے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے ملاّ سراج الدین کی خدمت حاصل کر لی۔ ملاّ جی روزانہ شام کو چار بجے انگریز کمشنر کو ٹیوشن پڑھانے آتے تھے، موصوف عصر اور مغرب کی نماز کمشنر کی کوٹھی ہی پر ادا کرتے تھے۔

نماز کے دوران قرآن کی تلاوت اور رکوع سجدے کی ہیئت کو دیکھ کر آخر کار ایک دن انگریز کی بیٹی اسلام قبول کر لیتی ہے۔ مگر افسوس کہ اسلام قبول کرنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد عین جوانی میں ہی اس کی وفات ہو جاتی ہے اور اسے عیسائی دستور کے مطابق عیسائی قبرستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی موت سے پہلے ملاّ جی کو وصیت کر دیتی ہے کہ مرنے کے بعد میری لاش کو عیسائی قبرستان سے نکال کر اسلامی طریقے کے مطابق مجھے کسی مسلمان قبرستان میں دفن کر دیں۔ حسن اتفاق کے جس روز فاطمہ کی موت ہوتی ہے اسی روز الگ الگ جگہوں پر دو لوگوں کی اور موت ہو جاتی ہے۔ قدرت کا ایسا کرشمہ ہوتا ہے کہ دفن ہونے کے بعد قبرستان سے تینوں کی لاشیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہیں۔ ان تمام واقعات کو ارشد القادری نے حسین پیرائے میں ڈھالا ہے اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے، دھیرے دھیرے کہانی میں تجسس پیدا ہوتا ہے اور یہ تجسس کہانی کے آخر تک قائم رہتا ہے، جلوۂ زیبا کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ہزاروں لالہ رخوں اور زہرہ جمالوں کی کہانیاں اس کی ایک ایک ادا میں سمٹ آئی تھیں۔ سرشار آنکھوں سے شراب کے پیمانے چھلکتے، مہتاب کی طرح درخشاں پیشانی ہر وقت موج نور میں غرق رہتی۔ چلتی فتنۂ حشر جگاتی، باتیں کرتی تو پھول جھڑتے، جمال و رعنائی اور حسن و دلکشی کا وہ ایک ایسا مجسمہ تھی کہ مغربی تہذیب کے گھرانے میں بھی ہر وقت پردے میں رہتی تھی۔ ایک مالدار باپ کی اکلوتی بیٹی، اس پر مزاج میں نفاست، طبیعت میں لطافت اور ناز و نعمت کی زندگی سارے خاندان کی راج دلاری بن گئی تھی، سیرت و خصلت کے اعتبار سے بھی وہ نہایت پاک طینت، نیک سرشت اور شریف الطبع لڑکی تھی۔ شرم و حیا، علم و ہنر، ذہانت و دانائی اور متانت و سنجیدگی میں دور دور اس کا کہیں جواب نہ تھا۔ سارا خاندان اس کے حسن اخلاق سے مسخر تھا۔ غیرت فطری ہی کا نتیجہ تھا

کہ والدین کے اصرار کے باوجود بھی وہ کبھی گرجا نہیں جاتی تھی۔''(10)

ارشد القادری نے کتنے دلکش انداز میں اس کے حسن اور عادت واطوار کو پیش کیا ہے، اختصار اور جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے شب و روز کی تفصیل بڑے مؤثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ ارشد القادری کی حکایت نگاری میں فصاحت و بلاغت کا موجزن سمندر اور منظر کشی کی دلکشی بھی ہے۔

ایک دن کمشنر کی بیٹی ٹھیک مغرب کے وقت اس کمرے کے قریب سے گزری، جہاں ملاّ جی نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن کی آواز سن کر اس کے قدم اچانک رک گیے۔ چند ہی لمحے کے بعد دروازے کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ نماز پڑھنے کے طریقے اور قرآن کی آواز سے کمشنر کی بیٹی کس طرح متاثر ہوتی ہے، اقتباس دیکھیں:

''زندگی میں پہلی بار اس نغمۂ حیات سے اس کے کان آشنا ہوئے تھے۔ ایک نا معلوم کیف سے وہ بے خود ہوگئی۔ عالم اشتیاق میں پھر وہ آگے بڑھی اور پردے کی اوٹ سے ملاّ جی کو ایک نظر دیکھا۔ نماز کی ہیئت عبادت دیکھ کر وہ حیرت میں ڈوب گئی ہاتھ باندھ کر ساکت و مؤدب کھڑا رہنا، پھر سرنگوں ہو جانا اور اس کے بعد ماتھا ٹیکنا عجز و نیاز کی یہ ادائیں، اس کی نگاہوں کے لیے اچنبھے سے کم نہیں تھیں۔ اب سے پہلے اس کی آنکھوں نے یہ روح پرور مناظر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جب تک ملا جی نماز پڑھتے رہے وہ تصویر حیرت بنی دیکھتی رہی۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد جب وہ واپس لوٹی تو جذبات کے سمندر میں ایک تلاطم سا برپا تھا۔''(11)

ارشد القادری نے کتنی اچھی منظر کشی کی ہے ایسا لگتا ہے سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت کو چند جملوں میں سمیٹ لیا ہے یہ ارشد القادری کا کمال ہے کہ بالکل سادہ جملوں کے ذریعے اپنی فنی چابکدستی سے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔

ناز کی پلی ہوئی لاڈلی بیٹی روزانہ صبح کو نئے کپڑے پہن کر باپ کو آداب کیا کرتی تھی، باپ کے دل کی شادابی اور روح کی آسودگی کا یہ سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ آج وہ بڑی سج دھج سے آداب کرنے آئی تھی۔ آداب سے فارغ ہو کر مچلتے ہوئے ناز سے کہا اقتباس ملاحظہ کریں:

''فادر! ایک درخواست پیش کروں؟ قبول فرمایئے گا۔'' بیٹی کے ان الفاظ پر باپ کی روح جھوم اٹھی۔ شفقت پدری کا جذبہ پھوٹ پڑا۔ فرطِ محبت میں بے قابو ہو کر جواب دیا۔ میری لخت جگر! ساری زندگی یہ آرزو رہ گئی کہ دوسرے بچوں کی طرح تم بھی کچھ فرمائش کرو اور میں اسے پوری کر کے تمہاری مسرتوں کا تماشہ دیکھوں۔ لیکن نہ جانے تمہارا افتادِ طبع کیسی واقع ہوئی ہے کہ یہ آرزو تشنہ ہی رہی۔ اب

جب زندگی میں پہلی بار اپنے ارمان کے اظہار کے لیے تمہاری زبان کھلی ہے تو کیا اب یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے کہ میں اسے قبول کروں گا یا نہیں تمھارے علاوہ کوئی میری زندگی کی امیدوں کا مرکز ہے جس کے لیے کوئی بات اٹھا رکھوں گا۔''(12)

ارشد القادری نے مکالمے کو مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے انگریزی لفظ بھی استعمال کیے ہیں۔

پدرانہ شفقت کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے کتنے اچھے اچھے الفاظ منتخب کیے ہیں۔ مثلاً۔ باپ کی روح جھوم اٹھی، شفقتِ پدری کا جذبہ پھوٹ پڑا۔ فرطِ محبت میں بے قابو ہو کر میری لختِ جگر، زندگی کی امیدوں کا مرکز، اس سے باپ اور بیٹی کے درمیان محبت کی شدت کا پتہ چلتا ہے، بلکہ عام طور پر لوگ اپنی بیٹی سے اتنی والہانہ محبت نہیں رکھتے ہیں۔

کمشنر کی بیٹی ملا جی سے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیغمبر اسلام کی سیرت پر مسلمان مصنفین کی چند کتابیں مانگ کر پڑھتی ہے، نماز و قرآن والے پیغمبر کی زندگی سے واقف ہونے کا موقع حاصل کر کے اس کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ جذبۂ شوق کے عالم میں پہلا ورق کھولا اور کائنات کی سب سے معظم ترین ہستی کی زندگی کا مطالعہ شروع کیا اقتباس دیکھیں:

''ورق ورق پر فضل و رحمت، جلال و جمال، عظمت و زیبائی، طہارت و تقدس، صبر و تحمل، جود و کرم، زہد و عبادت، فقر و ایثار، علم و حکمت، اعجاز و توانائی، قدرت و اختیار، قرب الٰہی کی جلوہ آرائی اور آسمان شوکت و اقتدار کے مناظر دیکھ دیکھ کر دل کی دنیا جگمگا اٹھی، فرط شوق میں پلکوں پہ موتی کے قطرے جھلملانے لگے۔ لالہ کی پنکھڑی جیسے ہونٹ حرکت میں آئے اور ننھی سی آواز فضا میں گونجی۔ محمد کے خدا وند! تو گواہ رہنا کہ مسیحی مذہب سے نکل کر تجھ پر اور تیرے آخری رسول پر ایمان لاتی ہوں۔ اے قادر و توانا معبود! تیرے محبوب پیغمبر کا واسطہ میری آنے والی زندگی کو کفر کی یلغار سے محفوظ رکھنا۔''(13)

ارشد القادری نے مرکب اور ہم آہنگ الفاظ کا حسین امتزاج پیش کیا ہے، لفظوں کے تکرار سے بھی کام لیا ہے جس سے جملوں میں آہنگ اور نغمگی پیدا ہو گئی ہے، تشبیہ اور استعارے سے بھی خوب کام لیا ہے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد جب وہ پہلی مرتبہ مسجد سے اذان کی آواز سنتی ہے تو اس کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ارشد القادری نے یوں بیان کیا ہے:

''کلمۂ اسلام سن کر دل بے تاب ہو گیا۔ ایمان کی امنگیں جاگ اٹھیں، آج چہرہ بشاشت سے کھلا جا رہا تھا، کونین کی ارجمندی بال بال سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک لالہ رخ حسینہ کا خود اپنا ہی جمال کیا کم تھا کہ وہ چشمۂ نور میں غوطہ لگا کر آ گئی تھی۔ اب تو وہ گل کدہ فردوس کی حور معلوم ہو رہی تھی۔ فرط تابندگی سے چہرے پر نظر جمانا مشکل تھا۔(14)

اسلام قبول کرنے کی خوشی اور خوشی سے پیدا ہونے والی تبدیلی جو اس کے جسم کے ایک ایک حصے سے نمایاں ہو رہی تھی اس کی مکمل وضاحت کر دی گئی ہے۔

ارشد القادری نے جہاں مرکب، مخلوط، ہم آہنگ، شگفتہ اور شیریں الفاظ کا استعمال کیا ہے وہیں انھوں نے بالکل سادہ عام فہم اور سلیس اسلوب کا استعمال بھی کیا ہے، مثال کے طور پر جلوۂ زیبا کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''نیند کچھ گہری نہیں تھی۔ صرف پلک جھپکتی تھی کہ ملّا جی نے ایک نہایت حسین و دلکش خواب دیکھا وہی کمشنر کی بیٹی فاطمہ حورانِ خلد کے جھرمٹ میں سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ قریب آ کر اس نے سلام کیا۔ عالم برزخ کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس نے کہا۔ میری روح جب عالم بالا کی طرف لائی گئی تو رحمت الٰہی نے مجھے ڈھانپ لیا میرے کفن کا تار تار بارش نور میں بھیگ گیا۔ میرے گمان سے زیادہ رحمت نے میری توقیر و اعزاز کا اہتمام فرمایا۔ حوران خلد نے مجھے چشمۂ نور میں غوطہ دیا میں نکھر گئی۔ میرے حسن کی چاندنی جنت کے میدانوں میں ہر طرف بکھر گئی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ عالم برزخ میں ہر طرف شوکت محمدی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ سارے انبیاء مرسلین ان کے دربار کے نیاز مند حاضر باش ہیں۔''(15)

مندرجہ بالا اقتباس بیانیہ نثر کے ساتھ ساتھ تاثراتی نثر کا بھی اچھا نمونہ ہے۔ ارشد القادری کے اس کہانی کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ کہیں پر بھی جھول نظر نہیں آتا۔ پوری کہانی ایک دوسرے میں پیروئی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہانی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہے اور اختتام کو پہنچتی ہے۔ کہانی بیانیہ انداز میں ہے اس کی زبان آسان اور عام فہم ہے لیکن اس کے ادبی پیرائے میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ ان کی یہی خوبی ہے کہ وہ سہل زبان کا استعمال بھی اتنی خوبی سے کرتے ہیں کہ اس میں ادبی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں ارشد القادری نے واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں اور بیان کرنے کا انداز ایسا ہے کہ پورا سماں آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔

سوداگر کی بیٹی

سوداگر کی بیٹی اس مجموعے کی دوسری کہانی ہے۔ اس کہانی میں طوالت ہے، کہانی میں کئی اہم موڑ آتے ہیں، جن کا ایک دوسرے سے گہرا ربط ہے۔ ارشد القادری نے کہانی میں ایک دوسرے کے بیچ تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔ کہانی کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے اور جھول نام کی چیز کہیں نہیں پائی جاتی ہے، اس کہانی کے دو اہم کردار ہیں غزالہ اور ملکہ دونوں آپس میں سگی بہنیں ہیں، دو ضمنی کردار ہیں، غزالہ کے والد اور چچا۔

یہ کہانی سمرقند کے ایک ظالم اور عیش پسند بادشاہ کی ہے، اس کی عیش پرستی میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ شہر کے خوبصورت لڑکیوں کو اپنی دلہن بنا کر شاہی محل میں لے آتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد دلہن کو ہمیشہ کے لیے ایک قیدخانے میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر دوسری شادی کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ اتفاقاً دونوں بہنیں الگ الگ طریقے سے شاہی محل میں قید کر لی جاتی ہیں، اوراس کے والد کو بادشاہ کے سپاہی دانستہ طور پر موت کے منہ میں ڈھکیل کر چلے جاتے ہیں مگر وہ کسی طرح بچ نکلتے ہیں اور بادشاہ کے ظلم کے خلاف لڑتے ہیں اور آخر کار ظلم کی ہار اور انسانیت کی جیت ہوتی ہے۔ یہ ایک انوکھی کہانی ہے، پیشکش میں ارشد القادری نے بڑی فن کاری سے کام لیا ہے۔ 'سوداگر کی بیٹی' میں کامیاب بیانیہ کے تمام خصائص موجود ہیں اور معنیاتی تہ داری اور حقیقت نگاری و استعاراتی اور علامتی کشادہ کیفیت بھی موجود ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایک مرتبہ وہ بھیس بدل کر شہر کے گلی کوچوں سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک مہ جبیں دو شیزہ پر پڑی جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر رہی تھی۔ لڑکی کیا تھی حسن و جمال کا ایک مرقع تھی، چہرہ ایسا تابناک تھا جیسے اس پر کسی نے چاندنی کا غازہ مل دیا ہو، شباب کی رعنائیوں میں وہ کھلے گلاب کی طرح چمن کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ نظر پڑتے ہی بادشاہ کے دل پر بجلی گر پڑی، ایک نشتر تھا جو جگر کے آر پار ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر غور سے اس نے اس گھر کو دیکھا اور سلگتی ہوئی آرزوؤں کے ساتھ اپنے محل کی طرف واپس لوٹ آیا.....

وزیر! آج پہلی بار میں نے انسانی پیکر میں ایک مہ کامل کو دیکھا ہے۔ اس کے رخ کی چاندنی سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس کے تصور میں ایک لمحہ دل کو قرار نہیں۔ اس کے حسنِ قیامت خیز نے میری ہستی کا سارا ضبط و شکیب چھین لیا۔ زندگی میں ایسا غارت گر ہوش میری نظر سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ جیسے بھی ممکن ہو میرے سلگتے ہوئے دل کی آگ بجھاؤ۔'' (16)

اس میں ارشد القادری نے منظر کشی کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں اور بیان کرنے کا انداز ایسا ہے کہ پورا سماں

آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

جب غزالہ کے چچا بادشاہ کے بھیجے ہوئے شادی کے پیغام کو قبول نہیں کرتا ہے تب وزیر پر اس کا کیا اور کیسا ردعمل ہوتا ہے اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ جواب سن کر شدت غیظ میں وزیر کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی، گرجتی ہوئی آواز میں اس نے کہا:

عزت و وقار کے ساتھ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اگر تم تیار نہیں ہو تو یاد رکھو کہ صبح ہونے سے پہلے تمہاری بھتیجی حرم سرائے شاہی کی زینت بنا لی جائے گی۔ وزیر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بوڑھا شخص کانپ اٹھا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ وہ میرے ضمیر کی آواز تھی جس کا میں نے اظہار کیا۔ شاہی قہر و جبر کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اغواء کا حکم نہ دیا جائے، میں اپنی بھتیجی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے کو تیار ہوں۔ وزیر کا غصہ اتر گیا۔ بادشاہ کے چہرے کی شکن بھی مٹ گئی۔'' (17)

ارشد القادری نے ایک ظالم بادشاہ اور وزیر کے ساتھ ساتھ ایک بے بس اور مظلوم چچا کی کتنی اچھی منظر کشی کی ہے۔ ان کے الفاظ عام فہم اور جملے سیدھے سادے اور سپاٹ ہوتے ہیں۔ عبارت کی سادگی اور برجستگی ان کا وصف خاص ہے۔ ارشد القادری کی تحریروں میں لفظوں کی مخصوص ترتیب اور جملوں کی خوبصورت ساخت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے جملے عموماً سادہ ہوتے ہیں معنی و مفہوم کی پیچیدگی کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا۔ عبارت کی روانی اس میں مزید حسن عطا کرتی ہے۔ ایک اقتباس سے ان باتوں کا جواز مل جائے گا:

''دلہن کی پالکی جیسے ہی شاہی محل کے دروازے پر پہنچی، کنیزوں اور خواصوں کے ہجوم نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور پھولوں کی بارش میں اسے حرم سرائے خاص تک لے گئیں۔ شب زفاف سے پہلے دلہن کو ملکہ بنانے کی رسم ادا کی گئی۔ بادشاہ نے اس تقریب میں اپنا وہ تاج شاہی اتار کر دلہن کے سر پر رکھ دیا، جس میں کروڑوں روپے کے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اب وہ سوداگر کی بیٹی نہیں تھی ایک بہت بڑی سلطنت کی ملکہ تھی۔ سارا محل اس کے حسن کی چاندنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ پروانے کی طرح بادشاہ کی شیفتگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے ملکہ کی جدائی گوارا نہ تھی۔ دونوں کی زندگی نسیم عشق کی موجوں سے کھیلتی رہی۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ شاہی محل کی دیواروں پر سے چاندنی ڈھلنے لگی۔ بہار کا موسم، دبے پاؤں صحن چمن سے رخصت ہونے لگا۔ لالہ کی طرح عشق و وارفتگی کی دہکتی ہوئی آگ اب آہستہ آہستہ اڑتی ہوئی خاکستر میں تبدیل ہونے لگی۔ بادشاہ کے اضطراب شوق کا چڑھا ہوا دریا دن بدن اترنے لگا۔ ملکہ بھی کھوئی کھوئی سی رہنے لگی، وہی ملکہ جس کے بغیر ایک لمحہ بھی

دل پر شاق گزرتا تھا۔ اب کئی کئی دن تک بادشاہ کو اس سے ملاقات کی فرصت نہیں ملتی تھی۔'' (18)

یہاں نہ تو شوخ و سنج زبان و بیان ہے نہ ہی طنز و تعریض کے تلخ و تند نشتر، یہاں صرف شگفتہ و شیریں زبان کی چاشنی ملتی ہے۔

ارشد القادری کو عورتوں کی محاوراتی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ دیکھیے ''تریاہٹ'' اور نشہ ہرن ہونا کا استعمال کتنی خوبصورتی سے انھوں نے کیا ہے: ''اس لاڈلی کی ذرا خبر تو لینا۔ ابھی تک یہ سمجھ رہی ہیں کہ آغوش مادر میں ہی ہیں۔ کب سے ان کا ٹیسوا بہہ رہا ہے۔ ہزار سمجھانے کے بعد بھی یہاں کے ماحول میں ڈھلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جیسے بھی ہو آج ان کی تریاہٹ توڑ دو۔ حجلۂ عروس میں پہنچ جانے کے بعد خود ہی ان کا نشہ ہرن ہو جائے گا۔'' (19)

بلا شبہ ارشد القادری کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ روانی اور سلاست اور محاورات و ضرب الامثال کا برجستہ استعمال ان کے اسلوب کی شناخت ہے جو ان کے اسلوب کو شیریں و دلنشیں بناتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس:

''دروازے پر کنیزوں کا پہرہ تھا اور میں اندر اپنی تقدیر کا ماتم کر رہی تھی۔ سخت اضطراب تھا کہ میں اپنے ناموس کے مدفن کے قریب پہنچ گئی تھی۔ پردۂ غیب سے اب تک کوئی ہاتھ نمودار نہیں ہو رہا تھا پھر میرے ایمان و یقین کی دیوار ہلنے لگی۔ پھر مایوسیوں کے گرداب میں میرا دل ڈوبنے لگا۔ امید کا ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ جل رہا تھا وہ بھی آندھیوں کی زد پر تھا۔ دل کی امید و بیم کا یہی عالم تھا کہ اچانک توپ سر ہوئی۔ ایک چنگاری اڑی اور امید کا سارا خرمن جل گیا، ہٹو بچو اور مبارک سلامت کے شور سے سارا محل گونج اٹھا۔ اب میں اپنے آپ میں نہیں تھی۔ شدت اضطراب میں زمین پر لوٹنے لگی۔ دہشت سے میری رگوں کا خون منجمد ہونے لگا۔ موت کے سوا اب کوئی میرے ناموس کا محافظ نہیں رہ گیا تھا۔ اسی عالم مرگ میں ایک بد بخت کنیز نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔ ادب سے کھڑی ہو جاؤ۔ جہاں پناہ، زینے سے گزرتے ہوئے اب ادھر آنا ہی چاہتے ہیں۔ یہ خبر نشتر کی طرح میرے کلیجے میں چبھ گئی۔ میں ایک دم تلملا اٹھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔'' (20)

ارشد القادری اس کہانی کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا بھی مصیبت میں گرفتار رہو مگر خدا پر یقین اور بھروسہ رکھو صبر کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ خدا ایک نہ ایک دن بندے کی فریاد ضرور سنتا ہے اور اسے کامیابی و کامرانی نصیب ہوتی ہے، یہ اقتباس دیکھیں:

''آج میرے ایمان و یقین کے عروج کی کوئی انتہا نہیں تھی میں نے دست رحمت کی توانائیوں کا

بے حجاب تماشا دیکھا تھا۔ یہ راز اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا کہ انسان کسی آزمائش میں ثابت قدم رہے تو رحمت کارساز اسے تنہا نہیں چھوڑتی۔ خدا آباد رکھے طیبہ کی نورانی سرزمین کو گیتی کے مظلوموں کی وہ بہترین پناہ گاہ ہے۔ کوئی کہیں بھی رہے۔ دلِ مغموم کا نالہ رائیگاں نہیں جاتا۔''(21)

ارشد القادری صوت و آہنگ سے بھی اپنی عبارت کو سنوارنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے جملے میں ایک خاص قسم کا توازن اور ہم آہنگی ملتی ہے جو روانی بھی عطا کرتی ہے اور زبان کے لطف کو بھی دو بالا کر دیتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی فطری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جملے بالکل عام بول چال کی زبان میں استعمال کیے گیے ہیں۔ مکالمے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں گفتگو کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ فطرت کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورا سماں آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ یہ کہانی فن کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے اور پلاٹ کی ترتیب اور تنظیم میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

دل کا یقین

یہ کہانی تقریباً سو سال پہلے کی ہے، اس کا تعلق جونپور شہر کے ایک ہندو سنار خاندان سے ہے، اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ سندر لال۔ اس کی بیوی لکشمی اور بیٹی لالہ، اس کے پڑوسی ہیں سید شریف اور ان کی بیوی۔ سندر لال لاولد رہتا ہے، ہر جگہ سے علاج کروانے کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے، آخر کار سید شریف کی بیوی کے کہنے پر اللہ اور اس کے رسول پر بھروسہ کرتے ہوئے منت مانگتی ہے اور اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس طرح لالہ کی پیدائش ہوتی ہے، بچپن سے جوانی اور اس کے بعد شادی۔ ٹھیک شادی کے روز ایک عجیب وغریب حادثہ پیش آتا ہے اس حادثے سے گاؤں کے لوگ اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ سارا گاؤں اسلام قبول کر لیتا ہے، ارشد القادری نے ان تمام واقعات کو بہت ہی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے، اس کہانی میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ماں کے لیے ان کی اولاد کتنی اہم ہوتی ہے۔ اس کے لیے وہ کیا کیا منتیں کرتی ہے، اور والدین اپنے بچوں سے کتنی محبت کرتے ہیں:

''ناحق آپ اپنا خون جلاتے ہیں۔ اولاد قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے۔ وہ کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے۔ جس دن مالک کی کرپا ہو جائے گی آپ کے نام کا چراغ جل اٹھے گا۔ وقت کا انتظار کیجیے۔ سنسار کا پالن ہارا اپنی چوکھٹ سے محروم نہیں کرے گا ایک نہ ایک دن ہماری آرزوؤں کی کلی کھل کر رہے گی۔ حسین و دلکش بیوی کی باتوں سے شبنم کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوند ٹپکتی اور تھوڑی دیر کے لیے دل کی آگ بجھ جاتی، پھر کچھ عرصہ بعد دھواں اٹھنے لگتا اور پھر سلگنے کی کیفیت چہرے سے نمایاں ہو جاتی۔ بیوی کا حال بھی اپنے شوہر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا اس کی مامتا کا سوکھا ہوا چشمہ اس کی آغوش کی ویران محفل اور اس کی راتوں کی اداس تنہائی اسے اندر ہی اندر تڑپاتی رہتی تھی۔ چونکہ فطرتاً وہ بہت زیادہ متحمل مزاج اور صبر آزما واقع ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے دل کی بے قراریوں کا اظہار نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں بھی عورت کی سرشت بہت زیادہ غم فراموش اور شکیب پرور ہوتی ہے۔ ویسے اپنی غم نصیبی پر سلگتی وہ بھی رہتی تھی۔ لیکن آنکھوں کی چلمن سے دھواں نہیں اٹھتا تھا۔''(22)

ارشد القادری نے میاں بیوی کے دوران ہونے والی گفتگو کے ذریعے انکے احساسات و جزبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، ہندی الفاظ کا استعمال بھی اپنا ایک الگ حسن پیدا کر دیتا ہے، تشبیہہ اور استعارے سے بھی کام لیا گیا ہے۔

پہلے سید شریف کے گھر میں بڑی منتوں کے بعد ایک بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس واقعے کو شریف کی بیوی

اپنی پڑوسن بچھی کو سناتی ہے، دیکھیے ارشد القادری کا بیانیہ انداز کتنا نرالا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''جب ہم ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو گذشتہ سال اسی محرم کے موقع پر جبکہ ہم سب روزہ سے تھے، شام کو افطار کے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اچانک بیٹھے بٹھائے میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو رواں ہو گیے رہ رہ کر یہ خیال نشتر کی طرح دل میں چبھنے لگا کہ کاش آج ہماری گود میں بچے ہوتے تو وہ بھی افطار پر ہمارے ہمراہ بیٹھتے۔ ہر چند اس خیال کو دل سے نکالنا چاہتی تھی، لیکن آتش صحرا کی طرح دم کے دم میں یہ آگ سارے جسم میں پھیل گئی۔ بال بال چنگاری پھوٹنے لگی، سالہا سال سے ضبط و شکیب کا تھما ہوا ساگر آج امنڈ پڑا تھا۔ اسی اضطراب انگیز ہیجان کے عالم میں بے ساختہ منہ سے ایک چیخ نکل پڑی۔ یا حسین؟ مایوسیوں کے منجھدار سے اب تمہی ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کو باہر نکالو، ایک ایک کر کے امیدوں کے سارے دیپ بجھ گیے۔ فاطمہ کے راج دلارے! مانگنے والوں کو تمہاری چوکھٹ سے کیا نہیں ملا ہے۔ اپنے قدموں کے دھول کی ایک ہی چٹکی میرے آنچل میں ڈال دو۔ زندگی بھر کا ارمان پورا ہو جائے گا۔''(23)

اولاد کی چاہت کو ارشد القادری نے کتنے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، لفظوں کے ذریعے ایک درد اور ایک تڑپ پیدا کر دی ہے۔ صرف چار جملوں میں ماں کی فریاد کو مکمل کر دیا ہے۔

دوسرا اقتباس دیکھیں:

''بی بی! اپنی سرگذشت کہتی ہوں یقین کرو، میرا ستارہ گہن میں آ گیا تھا۔ خیریت ہوئی کہ جس سرکار سے میں نے بنتی کی تھی انھوں نے فوراً ہی مجھے سنبھال لیا۔ ورنہ میرے دل کا وشواش اٹھتا جا رہا تھا۔ آج میں سوچتی ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ کبھی کبھی تو ایسی ہوک اٹھتی ہے کہ کربلا کی بھومی پر جہاں ان کا راج سنگھاسن رکھا ہے، اسے آنکھوں سے لگا کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ بہن! آج میں نے مان لیا کہ سارے جگت میں اسلام کی روحانی شکتی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو ماننے کے قابل یہی دھرم ہے جس پر آدمی چل کر ایسا امر ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے روح کے گیان کا سوتا نہیں سوکھتا۔ خیر سے دن گزرے تو میں بھی اپنے سرکار کے نام پر فقیروں کو خیرات لٹاؤں گی۔ اسی دن سارے شہر کو معلوم ہوگا کہ میرے دل کے اندھ وشواس میں کیا جادو تھا۔ اب سنسار میں میرا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے، انہی کے چرنوں میں تج دیا ہے۔''(24)

ارشد القادری نے اردو اور ہندی کے الفاظ کو ملا کر اپنی تحریروں میں جدت اور ندرت پیدا کر دی ہے، کردار کی

مناسبت سے الفاظ کا استعمال بالکل انوکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے ارشد القادری کو ہندی زبان وادب پر بھی عبور حاصل ہے۔
جب سنار کے گھر میں بچی پیدا ہوتی ہے تو اس کی خوبصورتی کا نقشہ دیکھیے، ارشد القادری کیسے کھینچتے ہیں۔ جامعیت اور اختصار کا نمونہ دیکھیے:

''بچی کیا تھی؟ حسن و زیبائی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک مورت تھی، جو دیکھتا حیران و ششدر رہ جاتا۔ سارے شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر مشہور ہو گئی کہ سنار کے گھر میں آسمان کی زہرہ اتر آئی ہے۔''(1)

لالہ کے دلہن بننے کا منظر اور اس کی خوبصورتی کو ارشد القادری نے کتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ تشبیہہ، استعارے اور ضرب الامثال کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے:

''آج سنار کے گھر میں مسرت و نشاط کی فصل بہار آ گئی تھی۔ اندر سے باہر تک ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ بڑی آرزوؤں کے بعد اکلوتی بیٹی کی شادی کے یہ دن نصیب ہوئے تھے۔ ارمانوں کے ہجوم میں آج لالہ دلہن بنائی جا رہی تھی۔ ایک مہینے تک ہلدی ایٹن نے اسے آب زر کی طرح چمکا دیا تھا فن کار مشاطاؤں نے جب اسے بنا سنوار کر حجلۂ عروسی میں پہنچایا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہو کے رہ گئیں۔ شفاف جھیل کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں میں کاجل کی لکیر، کالی گھٹاؤں کے افق پر سفید افشاں کی جگمگاہٹ اور بیچ میں سیندور کی لالی، موسم برسات کے ڈوبتے سورج کی تصویر اتار لائی تھی۔ ہزار اہتمام کے باوجود گھونگھٹ کا چلمن اس ماہ وش کی چاندنی پر حائل نہیں ہو سکا تھا۔ فرطِ حیا سے جھکی ہوئی پلکوں کا عالم سوئی ہوئی حیات کا صبح نمونہ تھا اور شادی کا سرخ جوڑا زیب تن کر لینے کے بعد تو ایسا لگتا تھا کہ کسی لالہ زار کی پری اتر آئی ہو۔'' (26)

اس سے متعلق دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''کہتے ہیں کہ آرسی درشن کے وقت کا منظر بڑا ہی رومان انگیز تھا۔ پہلی مرتبہ آئینے کے اندر دولہا نے ایک زہرہ جمال دوشیزہ اور پارسا دلہن کے چہرے کا عکس دیکھا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر حسن و زیبائی کے تیر و ترکش سے مسلح تھے۔ دونوں میں سے کسی کا وار خالی نہیں گیا۔ ایک دوسرے کے نشتر سے دونوں گھائل ہو کر رہ گیے۔ دلوں کے نازک آبگینے نظر کی چوٹ سنبھال نہیں سکے۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔''(27)

ارشد القادری زبان بھی ایسی استعمال کرتے ہیں جو عام متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہوتی ہے جس میں ادبیت کا حسن، برجستگی و شگفتگی، نادر تشبیہات، جدید تراکیب مخصوص بندشیں اور پر معنی علامات و اشارات جیسے صفات ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔

امین جواڑی

امین جواڑی اس مجموعے کی سب سے مختصر کہانی ہے، اس کہانی کا تعلق دارجلنگ کے سونے چاندی اور جواہرات کی تجارت کرنے والے سب سے بڑے تاجر عبدالرحمٰن جوہری سے ہے، اس کہانی میں تین اہم کردار ہیں عبدالرحمٰن جوہری، اس کی بیوی اور اکلوتا بیٹا محمد امین۔ باپ کے انتقال کرنے کے بعد محمد امین ساری دولت کا تنہا وارث رہتا ہے۔ کاروبار سنبھالتے ہی اسے جوئے کی لت لگ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار ایک دن گھر کا سارا سامان بک جاتا ہے اور وہ محمد امین سے امین جواڑی بن جاتا ہے، سب کچھ برباد ہو جانے کے بعد ماں کے کہنے پر بیٹا اجمیر چلنے کو تیار ہو جاتا۔ ماں بیٹا کسی طرح اجمیر خواجہ کے دربار میں پہونچتے ہیں اور اپنا دکھڑا سناتے ہیں۔ آخر کار ان کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ گھر لوٹنے کے بعد پھر سے خوشحالی لوٹ آتی ہے اور بیٹا امین صحیح راستے پر آجاتا ہے۔ دیکھیے ارشد القادری نے اس مختصر واقعے کو کس طرح بیان کیا ہے:

''کاروبار کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا اور خاندان کا وقار اپنے آخری نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ خوشحالی کے یہی دن تھے۔ بہار کے یہی موسم تھا، یہی مسکراتی ہوئی شام وسحر تھی۔ یہی خورشید اقبال کی عین دوپہر تھی کہ اچانک گردش ایام نے پلٹا کھایا، سورج گہنانے لگا۔ بادخزاں دبے پاؤں صحن چمن کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر شام وسحر کے چہرے تاریک ہو گیے۔ پھر خاندان کا وقار مجروح ہو گیا۔ پھر گھر کی پھیلی ہوئی رونقیں سمٹنے لگیں۔ قیامت آ گئی کہ پھر امین جوہری اپنے پرانے ساتھیوں کی محفل میں پہنچ گیا۔ پھر جوئے کی ریس شروع ہو گئی۔ پھر گھر کا سارا سرمایہ داؤں پر لگنے لگا۔ بینک کا سارا سرمایہ جوئے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہوس کی آگ بجھانے کے لیے قرض کی طرف ہاتھ بڑھے۔ دل کھول کر ساہو کاروں نے سودی قرضے دیئے اور کچھ دنوں کے بعد سننے میں آیا کہ دوکان اور ساری جائیداد دیں نیلام پر چڑھ گئیں۔ فرم کا نام ڈوب گیا۔ چند ہی دنوں میں ہرا بھرا چمن موت کے گھاٹ اتر گیا۔''(28)

مندرجہ بالا اقتباس کے تمام جملے تشبیہ و استعارے سے بھرے پڑے ہیں۔ اس اسلوب میں حقیقت بیانی ہے۔ لفظوں اور فقروں میں تشبیہوں اور استعاروں میں اور ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑھ کر کہانی کے پورے ماحول اور آس پاس کی ساری فضا کا منظر نہایت دلکش ہے۔

اس سے متعلق دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہر طرف جھما جھم نور کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر آنکھ پرنم تھی ہر دل پیکر فریاد تھا۔ ہر شخص شراب عرفان کے کیف میں سرشار نظر آ رہا تھا۔ شاہانہ کروفر اور شوکت جمال دیکھ کر دونوں حیرانی کے عالم میں

گم تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی عالم میں پہنچ گیے ہیں جو چوکھٹ کے سامنے کھڑے ہوتے ہی ماں کی حالت غیر ہوگئی۔ آنکھوں کا چشمۂ سیال پھوٹ پڑا۔ آلام کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی۔ اس طرح ٹوٹ کے اس نے فریاد کی کہ اس کی آہ وزاری سے لوگوں کے دل دہل گیے۔ یتیموں، بیواؤں اور بے سہاروں کے والی! گردشِ ایام کے ستائے ہوئے فریادی ایک نگاہ کرم کی طلب گار ہیں۔ مسرتوں اور خوش بختیوں کے راجہ! سنا ہے کہ دنیا کے ٹھکرائے ہوئے غم نصیبوں کو یہاں پناہ ملتی ہے۔ کروڑوں خانہ خراب آپ کے دربار سے شاد آباد واپس لوٹتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنی نظر نہ آنے والی چارہ گری کا ایک جلوہ دکھا دیجیے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے والے خواجہ! ہماری بھی قسمت کا ٹوٹا ہوا آبگینہ جوڑ دیجیے۔ سرکار! ایک بیوہ کی فریاد سن لو۔ ایک یتیم کی کشتی منجدھار سے نکال دو۔ تمہارا بخشا ہوا پھول مرجھا گیا ہے۔ اسے ہرا بھرا کر دو حضور!۔"(29)

اس سنجیدہ اور شگفتہ اسلوب کو پیدا کرنے میں انھیں سب سے بڑی مدد دی ہے قدرت بیان نے۔ وہ ہر بات کو شگفتہ اور لطیف انداز سے کہنے پر قادر ہیں۔ انھیں لفظیات پر کامل عبور حاصل ہے وہ کسی لفظ یا صفت کو بغیر سوچے سمجھے استعمال نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ہر لفظ کا ایک الگ مفہوم ہے اور خاص مقام۔

ارشد القادری کا پرشکوہ اسلوب قاری کو صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ مرعوب بھی کرتا ہے۔ انداز بیان کا وہ پیرایہ جس سے قاری الفاظ کے سیلاب میں بہہ جانے پر مجبور ہو جائے یا مواد کے انتخاب اور تنظیم کو انداز بیان کے ذریعہ وحدت تاثیر کی ایسی شکل دینا جس سے ایک زندہ وجود کا گمان ہو اور اس میں کسی عاشق کے اضطراب وجنون کی ایسی لہریں پیدا کرنا کہ اثر انگیزی کا لطف دوبالا ہو جائے۔ یہ کارنامہ صرف ارشد القادری ہی کا قلم انجام دے سکتا ہے، ان کے اسلوب میں جوش، حرکت، حرارت اور توانائی ہے۔

دل کی آشنائی

یہ کہانی امام احمد رضا خاں بریلوی کے ایک واقعے سے متعلق ہے، امام رضا پالکی میں سوار ہو کر ایک جلسے میں شریک ہونے کے لیے بریلی تشریف لاتے ہیں، کہاروں کی صف میں ایک مصیبت کا مارا آلِ رسول بھی شامل ہوتا ہے جس کی اطلاع احمد رضا کو کسی طرح ہو جاتی ہے۔ وہ بے حد پریشان ہو جاتے ہیں کہ میں نے آلِ رسول کے کاندھے پر سواری کر لی، قیامت کے روز میں کس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ دکھاؤں گا یہ سوچ کر وہ پالکی سے اترتے ہیں اور اس سے معافی مانگتے ہیں، یہی نہیں بلکہ پالکی میں بیٹھا کر اسے کچھ دور اپنے کاندھے پر لے جاتے ہیں۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آلِ رسول کے ساتھ جن کے دل کی عقیدت و اخلاص کا یہ عالم ہے، تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کی وارفتگی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ دیکھیے ارشد القادری نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس واقعے کو کس طرح پیش کیا ہے:

''آنے والے مہمان کی زندگی یہ ہے کہ وہ اپنے دولت کدے سے نکل کر یا تو فرائض بندگی کے لیے خدا خانے میں جاتا ہے یا پھر جذبۂ عشق کی تپش بڑھ جاتی ہے تو دیار حبیب کا سفر کرتا ہے، اس کے علاوہ اس کے شام و سحر اور شب و روز کا ایک ایک لمحہ دینی مہمات میں اس درجہ مصروف ہے کہ نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی اسے مہلت نہیں ملتی۔ اس کے حریم دل پر ہر وقت عشقِ بے نیاز کا پہرہ رہتا ہے ہزار انداز دلربائی کے باوجود آج تک خیال غیر کو بازیابی کی اجازت نہیں مل سکی ہے۔ اس کی نوکِ قلم کا ایک ایک قطرہ فکر و اعتماد کی جنتوں میں کوثر و تسنیم کی طرح پہرہ رہا ہے۔ اس کے خونِ جگر کی سرخی سے ویرانوں میں دین کے گلشن لہلہا اٹھے ہیں۔ اس کے عرفان و آگہی کی داستانیں چمن چمن میں پہنچ گئی ہیں اور لوح قرطاس سے گذر کر اب اس کے علم و دانش کا چراغ کشور دل کے شبستانوں میں جل رہا ہے۔''(30)

ارشد القادری نے کتنے حسین اور دلکش انداز میں احمد رضا کی حالات زندگی اور شب و روز کی مشغولیات کو پیش کر دیا ہے۔ پوری شخصیت کا مکمل احاطہ کر دیا ہے، احمد رضا سے متعلق دوسرا اقتباس دیکھیں:

''اور جہاں اہل ایمان کے لیے وہ لالہ کے جگر کی ٹھنڈک ہے وہیں اہل کفر کے حق میں وہ غیظ و جلال کا ایک دہکتا ہوا انگارہ ہے۔ اپنے محبوب کے گستاخوں پر جب وہ قلم کی تلوار اٹھاتا ہے تو انگلیوں کی ایک ایک جنبش پر تڑپتی ہوئی لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے۔ باطل کے جگر میں اس کے نشتر کا ڈالا ہوا شگاف زندگی کی آخری ہچکیوں تک مندمل نہیں ہوتا۔''(31)

ارشد القادری نے تشبیہہ اور استعارے کے ذریعے احمد رضا کی شخصیت کو نکھار کر رکھ دیا ہے، ان کے اندر جو رحم دلی اور ہمدردی کا مادہ ہے اس کی مکمل وضاحت بھی ارشد القادری نے خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ دو اقتباس ملاحظہ کریں:

''معزز شہزادے! میری گستاخی معاف کر دو، لاعلمی میں یہ خطا سرزد ہو گئی۔ ہائے غضب ہو گیا۔ جن کے کفش پا کا تاج میرے سر کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ان کے کاندھے پر میں نے سواری کی۔ قیامت کے دن اگر کہیں سرکار نے پوچھ لیا کہ احمد رضا! کیا میرے فرزندوں کا دوشِ نازنین اسی لیے تھا کہ وہ تیری سواری کا بوجھ اٹھائیں تو میں کیا جواب دوں گا۔ اسی وقت بھرے میدان حشر میں میرے ناموسِ عشق کی کتنی بڑی رسوائی ہوگی۔؟'' (32)

دوسرا اقتباس:

آہ! وہ منظر کتنا رقت انگیز اور دل گداز تھا۔ جب اہل سنت کا جلیل القدر امام کہاروں کی قطار سے لگ کر اپنے علم وفضل، جبہ و دستار اور اپنی عالمگیر شہرت کا سارا اعزاز خوشنودی حبیب کے لیے ایک گمنام مزدور کے قدموں پر نثار کر رہا تھا۔'' (33)

ایک برھمن دو شیزہ

یہ اس وقت کی کہانی ہے جب ہندوستان میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ اس کہانی کا تعلق کاشی کے ایک پنڈت گھرانے سے ہے۔ اس کہانی کے چار اہم کردار ہیں۔ پنڈت لالہ رام اس کی بیٹی شکنتلا بادشاہ اورنگ زیب اور بنارس کا کوتوال ابراہیم خاں۔ اس کہانی کا اہم کردار ظالم اور عیاش ابراہیم خاں ہے۔ اس کی عیاشیوں سے بنارس کے لوگ پریشان رہتے ہیں۔ ہر خوبصورت لڑکی کو وہ اپنے زور وظلم سے دلہن بنا کر اپنے گھر لے آتا ہے۔ ایک دن اس کے ظلم کا شکار شکنتلا بھی ہو جاتی ہے۔ مگر وقت رہتے وہ بادشاہ اورنگ زیب سے مل کر تمام حالات بیان کرتی ہے۔ بادشاہ کے انصاف پسندی کے وجہ سے وہ اس مصیبت سے بچ جاتی ہے اور ظالم ابراہیم خاں عیاشی کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ارشد القادری نے پورے واقعے کو حسین پیرائے میں سمو کر دل کش انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ٹھیک انہی دنوں میں حضرت اورنگ زیب کی حکومت کی طرف سے ابراہیم خاں نامی ایک شخص بنارس کا کوتوال مقرر ہو کر آیا تھا۔ ابھی اسے آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ سارے بنارس میں اس کے خلاف زبردست خوف و دہشت پھیل گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک نہایت ظالم اور عیاش شخص تھا۔ اتنے دبدبے سے رہتا تھا کہ کوئی اس کے خلاف پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کی ہوسناک نگاہوں کی زد سے کسی نو شگفتہ کلی کا بچ نکلنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے جاسوس گلی گلی چلمنوں کے پیچھے مہکتی ہوئی زلفوں کا سراغ لگاتے پھرتے۔ ایک دن جاسوسوں نے فاتحانہ انداز میں کوتوال کو یہ اطلاع بہم پہنچائی۔'' (34)

ابراہیم خاں نے اپنے عیاشیوں کے لیے جن جن حربوں کا استعمال کیا ہے ان تمام باتوں کو ارشد القادری نے ایک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ابراہیم خاں کی ذلیل حرکتیں بالکل آشکارا ہو گئی ہیں۔

ارشد القادری جب شکنتلا کی خوبصورتی بیان کرتے ہیں تو تشبیہہ اور استعارے سے عبارت کو رنگین بنا دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

''وہ چلتی ہے تو قدموں کی آہٹ سے قیامت جاگ اٹھتی ہے، اس کی خمار آلود آنکھوں میں جیسے میخانہ تیرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ اپنی زلفیں بکھیر دیتی ہے۔ تو ہر طرف کالی گھٹاؤں کا موسم امنڈنے لگتا ہے۔ اس کا ایک تبسم نہ جانے کتنے ناسوروں کا علاج ہے۔ اس کے رو پہلے بدن کی رنگت اتنی نکھری ہوئی ہے۔ جیسے کسی نے چاندی کا غازہ مل دیا ہو۔'' (35)

شکنتلا جب اپنے باپ سے گفتگو کرتی ہے تو وہ بالکل اپنے فطری انداز میں گفتگو کرتی ہے۔

ارشد القادری کردار اور ماحول کے مطابق ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور جملے کو دل کش بنا دیتے ہیں:

''باپو جی! آشا نہ توڑو۔ وقت سے پہلے ہمیں یتیم نہ بناؤ۔ بھگوان کی کرپا ہوگئی تو یہ گرہ کٹ جائے گی۔ اور مان لو اگر وہی وقت آ گیا تو ہم سب کے سب ایک ساتھ ہی گنگا جی کے چرنوں میں اپنا شرن بنائیں گے۔'' (36)

شکنتلا جب اورنگ زیب سے بات کرتی ہے تب بھی اس کا انداز ویسا ہی ہے۔ ارشد القادری دونوں جگہ ہندی الفاظ کے ذریعے مکالمے میں جان ڈال دیتے ہیں:

''شکنتلا نے دوشالے سے اپنا منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ بھارت کے سوامی مجھے پورا وشواس تھا کہ جسے آپ نے اپنی بیٹی کہا ہے اس کی لجّا بچانے ضرور آؤ گے۔ اپنی محبوب رعایا کے ساتھ یہ انیائے تم سے ہرگز نہ دیکھا جائے گا۔ اسی لیے میں نے اپنی زمین میں ایک چبوترا پہلے ہی بنا دیا تھا تاکہ ہمارے شہنشاہ کو نماز پڑھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش نہ کرنی پڑے۔ اسی چبوترے پر پانی اور بھوجن کا بھی انتظام ہے۔'' (37)

ارشد القادری جب شہنشاہ سے کوئی بات کہلوانا چاہتے ہیں تو الفاظ بھی شہنشاہیت والے استعمال کرتے ہیں انداز خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آواز کانوں میں دیر تک گونج رہی ہے۔

''کیوں بے ننگ اسلام؟ اسی کرتوت کے لیے تجھے بنارس بھیجا گیا تھا۔ دن دہاڑے میری رعایا کی آبرو کا خون کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ ایک ہول ناک قہر و ظلم کا یہ تماشا رچاتے ہوئے تجھے اس کا بھی خیال نہیں آیا کہ حق کے مقابلے میں اورنگ زیب کی تلوار اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ کیا تجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ سارا ہندوستان اسلام کی پناہ میں ہے۔ یہاں کے اقوام کی عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ ایک مسلمان کا سب سے مقدس فریضہ ہے۔'' (38)

ارشد القادری نے کردار کے مناسبت سے زبان و بیان میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اور یہی ان کا خاصہ ہے۔

دو شہزادے

کربلا کے مقتل سے خاندان رسالت کا جولٹا ہوا قافلہ مدینے کو واپس ہوا تھا، یہ دونوں بھائی اسی قافلے کی نسل سے ہیں۔ یہ دونوں کمسن اور یتیم بھی ہیں۔ارشد القادری نے اس واقعے کو بہت ہی دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس واقعے میں ایک مسلمان رئیس اور ایک مجوسی کے اچھے اور برے کردار کی عکاسی کی گئی ہے۔ دونوں بچے قافلے سے بھٹک جاتے ہیں اور پناہ کی تلاش میں رہتے ہیں جس کی عکاسی ارشد القادری نے یوں کی ہے:

''ہم لوگ آل رسول ہیں۔یتیم بھی ہیں اور غریب بھی، تین دن کے فاقے سے ہم نیم جان ہیں۔ تکلیف کی شدت برداشت نہیں ہوسکی تو آج جگر کی آگ بجھانے نکلے ہیں۔ وہ سامنے والے رئیس کے مکان پر گیے تھے۔ اسی نے ہمیں اپنے مکان کے دروازے سے اٹھا دیا۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ زمین تپ گئی ہے۔ ننگے پاؤں چلتے چلتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔تھوڑی دیر کے لیے تمھاری دیوار کے سائے میں بیٹھ گیے ہیں۔شام ہوتے ہوتے یہاں سے اٹھ جائیں گے۔''(39)

مجوسی کی بیوی ایک رقیق القلب عورت تھی۔ دونوں بھائیوں کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ نہلایا، کپڑے بدلوائے، بالوں پہ تیل رکھا، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بنا سنوار کر شوہر کے سامنے لائی۔ ارشد القادری نے جس انداز میں بچوں کا نقشہ کھینچا ہے اس سے ماں کی مامتا جاگ اٹھتی ہے، اور بچوں کے حسن کی عکاسی بھی دلکش انداز میں کر دیتے ہیں، جس سے پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

''ذرا دیکھیے! یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کاکل، یہ چاند کی طرح درخشاں پیشانی، یہ نور کی موجوں میں نکھرا ہوا چہرہ۔ یہ پروئے ہوئے موتیوں کی طرح دانتوں کی قطار، یہ پھول کی پنکھڑی کی طرح پتلے پتلے ہونٹ، یہ گل ریز تبسم، یہ گہر بار تکلم، یہ رحمتوں کا سویرا، یہ سرگیں آنکھیں، یہ معصوم اداؤں کا چشمۂ سیال، سچ بتایئے کیا یتیموں کی یہی سج دھج ہوتی ہے؟ خبردار آج سے میرے ان جگر پاروں کو جو یتیم کہے گا۔ میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔''(40)

ارشد القادری کے یہاں تاثراتی انداز بیان بھی ملتا ہے اور لفظی مرقع کشی بھی کامیابی کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔انھوں نے جو انداز تحریر اپنایا ہے وہ بلاشبہ سہل و سلیس اور رواں ہے۔

انعام شکست

یہ کہانی خلیفۂ بغداد کے درباری پہلوان جنید اور ایک اجنبی شخص جو اپنے آپ کو آلِ رسول بتاتا ہے کے تعلق سے ہے، کہانی کے دو مرکزی کردار ہیں جنید اور اجنبی شخص، زبان بالکل سادہ اور عام فہم استعمال کئے گیے ہیں۔ مگر کئی جگہوں پر ارشد القادری نے تشبیہہ اور استعارے سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایوانوں کے کنگورے جھک گیے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سرنگوں ہوگئیں۔ درختوں کی شاخیں سجدے میں گر پڑیں۔ بغداد کی زمین جھومنے لگی۔ بہاروں نے پھول برسائے، صبا نے خوشبو اڑائی۔ سحر نے اجالا کیا۔ رحمتوں نے فرش بچھائے اور درخشاں کرنوں سے حضرت جنید کے صحن کا چپہ چپہ معمور ہو گیا۔ طلعت جمال سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ دل کیف وسرور میں ڈوب گیا۔ درو دیوار شجر وحجر کو زبان مل گئی۔'' (41)

جب اجنبی شخص جنید سے کشتی لڑنے کے سلسلے میں وزیر سے بات کرتا ہے تو دیکھیے ارشد القادری کس طرح زبان کا استعمال کرتے ہیں:

''جنید کی شہرت ہی مجھے یہاں تک کھینچ کر لائی ہے۔ اسی اعتقاد وموہوم کی میں تردید کرنا چاہتا ہوں کہ ساری ریاست میں جنید کا کوئی مد مقابل نہیں رہ گیا ہے۔ قد وقامت کا شکوہ اور بازوؤں کا کس بل ہی فتح وشکست کا معیار نہیں ہے۔ فن کی ذہانت بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اطمینان رکھیے! میرا دماغی توازن اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔ سود وزیاں سمجھانے کے لیے مجھے ناصح کی ضرورت نہیں ہے۔ انجام کا سارا نقشہ میری نظر کے سامنے ہے اب غیر متعلق بحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے اثبات ونفی میں جواب دیا جائے۔ اجنبی شخص نے فاتحانہ تیور کے ساتھ جواب دیا۔'' (42)

ارشد القادری کا طرز نگارش یکساں اور ہموار ہے اور اگر چہ موضوع کے اعتبار سے اسلوب میں ایک فطری اتار چڑھاؤ اور بلندی وپستی ضرور موجود ہے اور ایسا محسوس بھی ہوتا ہے، لیکن بنیادی طور پر اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔

چودھویں رات کی دو شیزہ

یہ کہانی عرب کے ایک خوبصورت اور عبادت گزار نوجوان کی ہے جو سمندری سفر میں جاتا ہے اور جہاز سمندر میں ڈوب جانے کے بعد وہ کسی طرح بچ کر دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے، وہاں کے لوگ غیر مسلم ہوتے ہیں اور سمندری دیو سے ہمیشہ پریشان رہتے ہیں نوجوان اپنی عبادت اور تقویٰ کے ذریعے دیو پر قابو پالیتا ہے۔ جس سے وہاں کے باشندے کافی خوش ہوتے ہیں اور پورا ملک اسلام قبول کر لیتا ہے۔ اس واقعے کو ارشد القادری نے دلچسپ اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''تاجروں کے اس گروہ میں ایک نہایت خوبرو نوجوان تھا، جو اپنے سارے قبیلے کی آنکھ کا تارا تھا۔ اس کی پیشانی سے طہارت نفس اور کردار کے تقدس کا نور جھلکتا رہتا تھا۔ اس کا باوقار حسین چہرہ اتنا دلکش و دل ربا تھا کہ ایک بار دیکھ لینے کے بعد ناممکن تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کی آرزو نہ پیدا ہو، جدھر سے وہ گزر جاتا نگاہوں کے چراغ جلنے لگتے۔ بات کرتا تو موتی لٹاتا۔ مسکراتا تو پھول برستے کتنے ہی سینوں میں اس کی نگہ التفات کی آرزو مچل مچل کر دفن ہو گئیں لیکن غیرت حیا کے بوجھ سے اس کی پلکیں ہمیشہ جھکی رہیں۔ ایک صالح پاکدامن اور اسلام کے غیور نوجوان کی جتنی خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ تنہا سب کا آئینہ دار تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں اس کی روح ایک نامعلوم کیف سے سرشار ہو جاتی تھی۔ گریۂ مناجات کی لذتوں نے اسے سحر خیز بنا دیا تھا۔'' (43)

ارشد القادری کے اسلوب نگارش میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کسی ادیب کو صاحب طرز بناتی ہیں اور طرز تحریر کو منفرد۔ یہ انفرادیت صرف ارشد القادری کی زبان و بیان پر قدرت کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ انھوں نے حسن بیان کے کچھ ایسے حربے بھی اپنائے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ مثلاً ان کی کوئی بھی کہانی پڑھیے اس کی ابتدا کے چند الفاظ یا چند جملے ہی ایسی کشش رکھتے ہیں کہ بغیر ختم کیے ہوئے آپ اسے نہیں رکھ سکتے۔

اقتباس ملاحظہ کریں:

''ظالم! آدمی ہے یا پتھر کی چٹان؟ ہزاروں دیوانے میرے جلوۂ حسن کی پرستش کے لیے تیار ہیں اور یہ ایک نظر دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ کیا میرے طلسم جمال کا سحر اب بے اثر ہو گیا؟ دلوں کے کشور میں میرے فتنۂ شباب کی غارت گری کیا بلا وجہ مشہور ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے! میری عشوہ طرازیوں کی تلوار زنگ آلود نہیں ہوئی ہے میرے ترکش کا تیر آج بھی بے خطا ہے میری

حشر برپا رعنایوں میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ یہی شخص انسانوں کی پرسوز فطرت سے محروم نظر آتا ہے۔'' (44)

اقتباس ارشد القادری کی قدرت کلام اور ندرت بیان کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کہانی نگار انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور جذبے کو ایسے عام فہم اور منتخب لفظوں میں پیش کر دینے پر قادر ہے کہ قاری کی نگاہوں کے سامنے وہ تاثر اور وہ جذبہ تصویر بن کر آجائے۔

کوچۂ جاناں

کوچۂ جاناں میں ایک ایسے شخص کی سرگزشت بیان کی گئی ہے جو عراق کا مشہور ڈاکو، غارت گر اور ستم پیشہ قاتل ہے۔ جس کا نام عبداللہ ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار عبداللہ ہے، کہانی اسی کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ ایک روز خواب میں وہ دیکھتا ہے کہ کوئی اسے برائی سے بھلائی کی طرف لوٹنے کی ترغیب دے رہا ہے، اس خواب کا ہی نتیجہ ہے کہ عبداللہ تمام برے کام چھوڑ کر ایک سچا مسلمان بن جاتا ہے۔ اس پورے واقعے کو ارشد القادری نے بہت ہی عام فہم زبان میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ کہانی ایک منطقی ربط کے تحت آگے بڑھتی ہے اور انجام تک پہنچتی ہے۔ ارشد القادری کے پاس معمولی سے معمولی بات کہنے کے لیے بھی ایک منفرد اسلوب موجود ہے۔ سادے سادے فقرے، عام روز مرہ کے الفاظ مگر وہ ان میں ایسی جدت، ساخت میں ایسی تبدیلی اور جملوں میں ایسا اختصار پیدا کر دیتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی بے حد اہم محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً:

''اچانک دل کے روزن سے کوئی بہت دھیمی آواز سے کہہ رہا تھا۔ ظالم! ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھ! تیرے نامۂ زندگی کا ایک ایک ورق سیاہ ہو چکا ہے۔ مظلوموں کی آہ، بے گناہوں کے خون، اور معاصی کے بوجھ سے تیری مغرور گردن اب ٹوٹنا ہی چاہتی ہے۔ مرنے کے بعد جب تو ایک باغی مجرم کی طرح خدائے قہار کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تو جلال کبریائی کی دہشت سے تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ انجام کی رسوائی اور جہنم کے ہولناک عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اب بھی وقت ہے۔ اٹھ! اپنے خاکی جسم سے شیطان کا یہ پیراہن اتار کر پھینک دے۔ مغرفت و کرم کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ جیسے بھی ممکن ہو اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر لے۔ ہاتفِ غیب کی یہ خاموش صدا نہایت تیز نشتر کی طرح عبد اللہ کے جگر کے پار ہو گئی اور اسے تڑپتے ہوئے بسمل کی طرح گھائل کر گئی۔'' (44)

پاکدامن نوجوان

ملک شام کی ایک سرسبز و شاداب پہاڑی کے دامن میں تین مسلم نوجوان رہا کرتے تھے۔ یہ تینوں سگے بھائی تھے۔ جو تلواروں کے سائے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ ان تینوں کا واحد مقصد تھا اپنے ملک سے باہر جا کر اسلام کی تبلیغ کرنا۔ اسی مقصد کے تحت یہ تینوں ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں مگر راستے میں رومی لشکر سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور تینوں بھائی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ رہائی کی صرف ایک ہی شرط ہوتی ہے عیسائی مذہب قبول کرنا۔ انکار کرنے پر دو بھائی کی جان چلی جاتی ہے۔ چھوٹے بھائی کو وزیر اس شرط پر لے جاتا ہے کہ وہ اپنی نوجوان اور حسین بیٹی کے ذریعے نوجوان کو عیسائی بنا دے گا۔ مگر وزیر کی بیٹی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود مذہب تبدیل نہیں کرا پاتی ہے بلکہ خود نوجوان سے اتنا متاثر ہوتی ہے کہ اسلام قبول کر لیتی ہے۔ اس واقعے کو ارشد القادری نے بہت ہی دلکش اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہانی میں آغاز سے انجام تک تسلسل برقرار ہے۔ قاری ایک پل کے لیے بھی بوجھل نہیں ہوتا ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں زبان و بیان پر قدرت کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ صاحب اسلوب نثر نگار نہ صرف نفس مضمون سے پوری طرح واقف ہوتا ہے بلکہ زبان و بیان کی تمام باریکیوں پر بھی نظر رکھتا ہے کہ موضوع اور اسلوب ہم آہنگ ہو جائیں۔ ارشد القادری نہ صرف یہ کہ نفس مضمون سے کماحقہ واقف رہتے ہیں بلکہ لفظوں کے اچھے نباض اور رمز شناس بھی ہیں۔ ان کے یہاں مضمون کی لالہ کاری بڑی حد تک لفظوں کے حسن اور فقروں کی جادوگری کی رہین منت ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''رات ڈھل چکی تھی۔ سارا محل نیند کی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی عالم میں روم کی سب سے حسین اور زہرہ جمال دوشیزہ عشوہ طراز اداؤں کی مجسم ساحرہ وزیر کی شہزادی اٹھی۔ زرنگار جوڑے زیب تن کیے۔ بال سنوارے۔ نظر کی تیغ پر پانی چڑھایا اور سامان قتل سے پوری طرح آراستہ ہو کر اس کمرے کا رخ کیا جہاں نوجوان قیام پذیر تھا۔ جونہی اندر داخل ہوئی۔ نوجوان زمین پر پیشانی رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پیشانی زمین پر لگی رہی وہ روتا رہا۔ رات ڈھلتی رہی وہ روتا رہا۔ چشم التفات کی امید میں بیٹھے بیٹھے سحر ہو گئی۔ اپنے خرام ناز سے قیامت ڈھانے والی شہزادی طرح طرح کی ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود سجدے سے ایک نوجوان کی پیشانی نہیں اٹھا سکی۔ جلوۂ حسن کا سارا غرور ٹوٹ گیا۔ ماتھے پر شکن ڈالے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ اپنی خواب گاہ کی طرف لوٹ گئی۔ دوسرے دن پھر قیامت کی ادائیں اپنے جلو میں لیے ہوئے شہزادی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ رات بھر کھڑا رہا۔ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ حسن مغرور آج بھی خراب و خستہ حالت میں واپس لوٹا۔'' (46)

پہلی ملاقات

پہلی ملاقات اس مجموعے کی ایسی کہانی ہے جس میں مذہب اسلام کے پھیلنے کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی۔ اسی وقت آپؐ نے رسالت کا اعلان کیا تھا جس کی عرب میں چاروں طرف مخالفت کی گئی تھی جب کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ان کی رسالت کو تسلیم کیا اور اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔ رسالت کے اعلان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوبکرؓ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ حضورؐ نے ابوبکرؓ سے رسالت اور اللہ کے وحی کا ماجرا بیان کیا جس پر ابوبکرؓ فوراً ایمان لے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ارشد القادری نے اس کہانی کا عنوان پہلی ملاقات رکھا۔

کہانی کچھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ایک غلام کے ہمراہ ملک شام تجارت کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں، راستے میں ایک رات جنگل میں راستہ بھٹک جاتے ہیں اور کسی دوسری طرف نکل جاتے ہیں بہ مشکل وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں انھیں عیسائیوں کا ایک کلیسا نظر آیا۔ سنسان جگہ پر آدمیوں کی آہٹ پا کر کلیسا سے ایک شخص باہر آیا اور دریافت کیا کہ آپ لوگ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا ہم عرب کے تاجر ہیں مکہ جہاں خدا کا گھر ہے۔ غالباً ہم راستہ بھول گئے ہیں اور ہم یہاں رات بسر کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں رات وہی بسر کرسکتا ہے جس پر گناہ کا کوئی دھبہ نہ ہو۔ ابوبکرؓ نے کہا کہ تمہارے پاس کیا ذریعہ ہے جس سے تم کسی بدکار کی بدکاری کا پتہ کرسکو گے۔ ابوبکرؓ نے کہا جاؤ اپنے شیخ سے میرے متعلق دریافت کرلو۔ تھوڑی دیر تک پس و پیش کے بعد اس شخص نے اپنے شیخ کو اطلاع دی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ملک عرب کا مکہ نامی ایک شہر سے دو مسافر بھٹکے ہوئے یہاں آ گئے ہیں اور کلیسا میں رات بسر کرنا چاہتے ہیں ظاہری طور پر وجاہت کے لحاظ سے ان میں ایک آقا معلوم ہوتا ہے جب کہ دوسرے کے چہرے سے ایک وفادار غلام کی علامتیں نمایاں ہیں۔''(47)

اس راہب نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام اور پھر ان کے والد کا نام دریافت کیا۔ اس کے بعد ان کو حجرے میں بلا کر آپؓ کے پورے جسم کا جائزہ لیا اس کے بعد بے خودی میں آواز دی۔ زحمت نہ ہو تو اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی ذرا میرے آنکھوں کے قریب کر دو۔ کلائی پر نگاہ ڈالتے ہی اس کے جذبات قابو سے باہر ہو گیے جس کا بیان ارشد القادری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''آج میری باتوں کا شاید تم یقین نہ کرسکو لیکن سن لو کہ مکے کے افق سے رسالت کا وہ خورشید انور

بہت جلد طلوع ہونے والا ہے جس کے جلو میں ایک روشن ستارہ کی طرح تم قیامت تک درخشاں رہو گے۔ آسمانی صحائف میں گیتی کے آخری پیغمبرؐ کے جلوہ گر ہونے کی جو نشاندہی کی گئی ہے اس کی واضح علامتیں میں تمہاری شخصیت کے آئینے میں پڑھ رہا ہوں تمہارے دمکتے ہوئے چہرے کی تو بات ہی کیا ہے کہ تمہارے داہنے ہاتھ کا یہ تل بھی ہماری کتاب میں موجود ہے۔ عبرانی زبان سے واقف ہو تو اپنا سراپا تم خود ہی ان آسمانی نوشتوں میں پڑھ لو۔'' (48)

اس واقعے کے بعد حضرت ابو بکرؓ ساری رات ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے طرح طرح کے تصورات کا طوفان امنڈتا رہا ایک لمحے کے لیے بھی انھیں نیند نہیں آئی۔ صبح جب رخصت ہوئے تو کئی مہینے کے بعد اپنی تجارتی مہم سے مکہ واپس لوٹے۔ سیدھا اپنے گھر تشریف لائے لیکن بے چین دل نے اتنی بھی مہلت نہ دی کہ سامان اتار کر گھر میں قدم رکھتے، اسی حال میں ابو طالب کے گھر پہنچے سرکار اقدس کے بابت دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ کوہ بوقبیس کی طرف تشریف لے گیے ہیں۔ جیسے ہی وہ کوہ بوقبیس کے قریب پہنچے دیکھا کہ سرکار ایک چٹان پر تشریف فرما ہیں آہٹ پاتے ہی رخ اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ مرحبا اھلاً وسہلاً مبارک ہو تمہارا آنا مبارک ہو۔

اعلان نبوت کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کی یہ بالکل پہلی ملاقات تھی سرکار اقدس نے ارشاد فرمایا۔ خدا کا آخری پیغمبر تمھیں حیات سرمدی کی دعوت دے رہا ہے اسے بغیر پس و پیش کے قبول کر لو۔ ابو بکرؓ نے جواب دیا سنا ہے کہ منصب رسالت کی تصدیق کے لیے پیغمبر اپنے ہمراہ کچھ نشانیاں لے کر آتے ہیں۔ میں بھی اطمینان قلب کے لیے کسی نشانی کا امیدوار ہوں، سرکار رسالت نے حضرت ابو بکر سے فرمایا ابھی زیادہ دن نہیں گذرے ہیں کلیسا کے راہب نے تمھارے داہنے ہاتھ کے تل کو دیکھ کر کیا کہا تھا۔ میری رسالت کی تصدیق کے لیے کیا آسمانی صحائف کے وہ نوشتے کافی نہیں ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا اقرار تھا توحید رسالت کا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی کے پس منظر میں منظر شہود پر آیا۔ ارشد القادری نے اس کہانی میں حضورؐ کی غیب دانی کے اعتراف پر زور دیا ہے۔

ارشد القادری کو اظہار کے تمام وسائل پر عبور حاصل ہے اسی لیے ان کا اسلوب منفرد ہے۔ اسلوب ایک وسیلہ ہے جو موضوع یا مضمون کو فن میں تبدیل کرتا ہے۔ ارشد القادری کے اسلوب میں اجزائے ترکیبی تلاشی کئے جائیں تو درج ذیل عناصر کی شکل میں ملتے ہیں۔

زبان پر قدرت۔ لطافت بیان۔ جزئیات نگاری۔ طنز و مزاح۔ تشبیہات و استعارات منظر نگاری اور کردار نگاری وغیرہ۔

اظہار الفاظ کا مرہون منت ہوتا ہے جو افکار کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس لیے الفاظ پر

قدرت ادیب کی پہلی کامیابی ہے جس سے وہ اپنے جذبات واحساسات کی عکاسی بہ طریق احسن کر سکے۔ اسی میں اس کے فن کو کمال حاصل ہوتا ہے، ارشد القادری کو الفاظ اور زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے جس کا استعمال وہ بڑی کاوش اور عرق ریزی سے کرتے ہیں۔ ان کی زبان صاف، سلیس اور شستہ و رفتہ ہے۔ صاف و شفاف الفاظ جو جملوں میں اس طرح استعمال کرتے ہیں، جیسے ہار کی لڑیوں میں موتی۔ اسی زبان سے انھوں نے زندگی کے ہر جذبے کو لطیف اور متاثر کن انداز میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنے الفاظ کے ذخیرے سے وہ صرف کام کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت الفاظ چنتے ہیں جو عام فہم اور سادے ہوتے ہیں۔ جن سے جملوں میں سادگی، سلاست، اختصار اور اکہرا پن پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب پر خارجی آرائش کا غلاف چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ جذبات کے خول، مبالغ کی چاشنی، خوبصورت اور انوکھی علامتوں اور رنگین و سحر طراز الفاظ کے جادو سے یہ کہانی یکسر خالی ہے۔ پیش کش میں فطری پن اور حقیقی حسن پیدا کرنے کے وہ سارے گروں سے واقف ہیں۔ انھیں خوبیوں نے ان کے اسلوب میں زندگی پیدا کی ہے۔

بلخ کی شہزادی

بلخ کی شہزادی ایک ایسے فقیر صفت انسان کی کہانی ہے جس میں پہلی نظر میں ہی شہزادی نے فقیر کا خرمن ہستی آنے واحد میں جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ حسین وادی اور دلکش مناظر کے لیے بلخ کا شہر عروس البلاد کے نام سے مشہور تھا۔ موسم گرما میں سیاحوں کے قافلے رواں دواں چلے آتے تھے۔ خراساں کی طرف سے سیاحوں کا ایک کارواں اترا اس قافلہ میں ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔

بہار کا موسم گذر جانے کے بعد تمام قافلے لوٹ گیے لیکن نوجوان بلخ کی خوشگوار موسم سے ایسا مانوس ہوا کہ یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ شاہی باغ کے قریب ایک کٹیا بنا لی اور وہیں رہنے لگا۔ ایک روز شاہی باغ میں بلخ کی شہزادی گشت کے لیے تشریف لائیں اتفاق سے اس نوجوان کی نظر شہزادی پر پڑی اور وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ دن بہ دن شہزادی کے عشق میں اس کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔

ایک دفعہ سلطانِ بلخ کا دربار لگا ہوا تھا اس ''فقیر'' نے بڑی ہمت کر کے دربار میں فریاد لے کر پہنچا۔ جب اس نے وزیر سے اپنی فریاد سنائی تو وزیر غصے سے لال ہو گیا اور بولا کہ تمہیں پتہ ہے اس گستاخی کی کتنی سخت سزا ہو سکتی ہے ۔تبھی بادشاہ حاضر ہوا اور اس نے وزیر کو سمجھایا کہ اسلام میں نکاح کا پیغام لے کر جانے کی اجازت ہے اس لیے اسے کسی طرح کی سزا نہیں دی جائے اور اس سے نرمی سے پیش آیا جائے۔ اس واقعے کو ارشد القادری نے کتنی حسن اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ایک بادشاہ اور فقیر کی زبان سے ادا ہونے والے جملے بالکل کردار کی مناسبت سے ادا کروائے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یہ مجرم نہیں ہے اسلام کا بخشا ہوا حق استعمال کر رہا ہے پیغام نکاح کے لیے اسلام میں شاہ گدا، امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس کی درخواست کا جواب تازیانوں کی دھمکی سے نہیں دیا جا سکتا اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ ایک ہفتہ بعد اپنا جواب حاصل کرنے کے لیے آئے۔''(49)

ایک ہفتے بعد جب فقیر دربار میں آیا تو وزیر نے نہایت نرمی سے فقیر کو بتایا کہ تمھیں ایک شرط پوری کرنی ہوگی اس کے بعد تمہارا پیغام قبول کر لیا جائے گا۔ اسے ایک سیاہ رنگ کا ہیرا شہزادی کی انگوٹھی کے لیے لانا ہوگا۔ اس طرح ایک لمبے سفر کی مصیبتوں کے بعد فقیر سیاہ ہیرا حاصل کر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد دربار سے ایک شرط پوری کرنے کو کہا جاتا ہے اس بار فقیر سمندر سے سفید موتی بھی لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس واقعے کو ارشد القادری نے اسلوب بیان کی جس روانی کے ساتھ پیش کیا ہے قابل تعریف ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''وزیر کا یہ جواب ایک تیز نشتر کی طرح فقیر کے سینے میں پیوست ہو گیا، دل کا وہ آبگینہ جو مایوسیوں کی زد سے بچا بچا کر رکھا تھا اچانک چھن سے ٹوٹ گیا۔ پہاڑوں اور دریاؤں کا فاتح آج کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ کر شکست کھا چکا تھا کہ یک بیک شاہی محل میں شور برپا ہوا۔ بدحواسی کے عالم میں ایک کنیزے نے آکر خبر دی کہ اچانک شہزادی بیہوش ہو چکی ہیں۔ بادشاہ کے پہنچتے پہنچتے شہزادی کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔''(50)

سارے محل میں کہرام مچ گیا۔اس حادثے پر سارا دربار سوگ میں ڈوب گیا۔شام ہوتے ہوتے شہزادی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔رات کو سناٹے میں فقیر قبرستان گیا اور قبر کو کھول کر شہزادی کی لاش کو باہر نکالا اور سیدھا اپنے کٹیا میں پہنچ گیا۔اس کے بعد عرش کی طرف مائل ہو کر دعا کرنے لگا۔اسی وقت کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی ایک طبیب کٹیا کے اندر داخل ہوا اس نے شہزادی کے نبض پر ہاتھ رکھا اور فقیر سے کہا شہزادی کی موت واقع نہیں ہوئی ہے سکتے کی حالت طاری ہے۔ پھر طبیب نے شہزادی کا علاج کیا اور چند لمحوں کے بعد شہزادی ہوش میں آ گئی۔ اپنے آپ کو بالکل نئے ماحول میں پا کر شہزادی گھبرا گئی حیران ہو کر پوچھا میں کہاں ہوں؟ جلد بتاؤ دماغ پاگل ہو رہا ہے۔ فقیر نے تفصیل وار شروع سے آخر تک سارا واقعہ بیان کر دیا۔ سارا ماجرا سن لینے کے بعد شہزادی کو عشق صادق کی حمایت میں قدرت کی کارفرمائی کا یقین آ گیا اس نے لجاتی ہوئی آواز میں کہا عشق صادق کو اب شرمندہ تعبیر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ طبیب نے کہا پھر دیر کیا ہے اور فقیر کو سامنے بٹھایا اور اپنے ساتھ ملازم کو شاہد بنا کر ایجاب و قبول کی رسم ادا کر دی اور ایک فرشتہ غیب کی طرح دعا مانگتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

المختصر یہ کہانی ارشد القادری کے اسلوب نگارش کے کئی رنگ رکھتا ہے۔ پوری کہانی میں سادہ زبان استعمال کیا گیا ہے اور عام بول چال کے بالکل قریب رکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں شاعرانہ اسلوب بیان اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اپنی روانی سے قاری کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

زبیدہ خاتون

زبیدہ خاتون اس مجموعے کی ایسی کہانی ہے جس میں بغداد کے خلیفہ ہارون رشید کی بیوی کی زندگی میں پیش آنے والے ایک روحانی واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشد القادری نے اس میں دنیاوی زندگی اور آخرت کی زندگی کے بیچ پیش آنے والے کشمکش کی بھرپور عکاسی کی ہے اور حقیقت پسندانہ انداز پیشکش اس کہانی کی بنیاد ہے۔ جابجا شاعرانہ اسلوب اختیار کر کے انھوں نے قاری کو مسحور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نگاہوں سے اوجھل ہو گیے تو اب ڈھونڈیے، ان کو چراغ رخ زیبا لے کر اور کہیں مل گئے تو عالم ایسا کہ ملنا نہ ملنا دونوں برابر ہزاروں کے بیچ لیکن تنہا خیال یار کے سوا کوئی شریک جاں نہیں دل کی دھڑکنوں سے قریب لیکن دور بہت دور سرحد امکان کے اس پار قدم قدم پر عشق بے نیاز کا جلوہ ادا ادا میں شان استغنا کا ظہور اسی عالم کیف سرور کی مستی کے ساتھ حضرت بہلول دانا دل کی ہزاروں بستیوں میں اتر گیے تھے۔'' (51)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ الفاظ شہنشاہ کونین، خاتم پیغمبران کی شریعت قاہرہ کے تھے سنت رسول کے احترام میں دیوانہ اپنے عالم سے پلٹ آیا جبروت عشق کی شراب ناب سے مخمور آنکھیں اوپر اٹھیں اور دل کا کشور جیت لینے والی آواز میں جواب دیا۔'' (52)

یہ کہانی روحانی جذبے کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور مصنف اس جذبے سے قاری کو بھی گزارنا چاہتا ہے اس سلسلے میں ارشد القادری کا زبان اور اسلوب کا انتخاب و استعمال سب سے اہم رول ادا کرتا ہے کیونکہ ادب وفن اگر وسیلہ اظہار ذات و کائنات ہے تو اسلوب یا طرز بیان اس اظہار کی روح۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مجھے اپنے نامۂ زندگی کا کوئی ایسا عمل نہیں یاد آرہا ہے جسے خدا کی اس عظیم الشان نعمت کا اجر قرار دوں۔ البتہ آج شام کو اچانک اپنے وقت کے مشہور و مجذوب حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی وہ ایک ویرانے میں اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنا رہے تھے کچھ دیر انھیں مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی پھر ان سے دریافت کیا یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟ جواب دیا جنت کا محل، پھر پوچھا بیچئے گا؟ جواب دیا ضرور بیچوں گا۔ اس کے بعد ایک درہم میں نے ان کی منھ مانگی قیمت ادا کی انھوں نے ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے کہا، جنت کا یہ محل میں نے زبیدہ خاتون کے ہاتھ پر بیچ دیا۔'' (53)

دربار کا ہیرا ایک خواب ایک حقیقت

ارشد القادری کی دوسری کہانیوں کی طرح کہانی دربار کا ہیرا ایک خواب ایک حقیقت پر بھی مقصدیت غالب ہے۔جیسا کہ کہانی کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خواب کے واقعے کو حقیقت کے آئینہ میں بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع تاریخ اسلام کے مطالعے، مذہب اور شعر و ادب سے وابستگی، زبان و بیان پر مکمل عبور اور حقائق و تخیل کی خوبصورت آمیزش سے تاریخی کہانی کو مقصدی رنگ دیتے ہوئے جس سلیقے سے نبھایا ہے وہ ان کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ ارشد القادری اسلوب بیان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور اس کو برتنے کے سلیقے کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب تو اور بھی تمہاری باتوں نے مجھے سراپا شوق بنا دیا اب میں تمھاری داستان غم سنے بغیر یہاں سے ٹل نہیں سکتا یقین کرو! میں ان راہگیروں میں سے نہیں ہوں جو تمہاری پرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستین رکھ کر چلے گئے میں نے خود بھی درد والم کے گہوارے میں پرورش پائی ہے اس لیے تمھارے دل کی دھڑکنوں کا راز مجھ پر چھپ نہیں سکتا، اب تمھیں اپنا قصۂ غم سنانا ہی ہوگا۔ مسافر نے پیار بھرے انداز میں کہا۔''(54)

اس طرح اگر صرف کہانی کے اسلوب بیان پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا اسلوب اتنا خوبصورت رواں دواں اور شائستہ ہے کہ پڑھنے والا خود بخود متاثر ہو کر اس کے ساتھ بندھا چلا جاتا ہے۔ سلسلہ وار بیان کے ساتھ ساتھ مصنف نے اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہو جس طرح اس کا اختتام دکھایا ہے وہ قاری کو ابتدا سے آخر تک کہانی پڑھنے میں محسور رکھتا ہے۔ ان کا آزمودہ اسلوب اور مخصوص طریق کار ہر کہانی کی طرح اس کہانی میں بھی استعاراتی علامتی اور تمثیلی ہے جو کہ اپنے مؤثر رنگ میں موجود ہے۔ یہاں ان کا اسلوب بڑے فطری اور بڑے بے ساختہ انداز سے آیا ہے ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''اے آغوش فطرت: تیرے دامن پر شاخ گل سے کوئی ننھا سا دانہ بھی گر جاتا ہے تو اسے ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تیری ہی دیانت و وفا پر نباتات کی انجمن آباد ہے میرے خزانہ کرم کا یہ ہیرا تو ہی اپنے دل میں رکھ لے نا؟ یہ سن کر زمین نے اپنا خاک آلودہ چہرہ ایوان شاہی کی دہلیز پر رکھ دیا اور لرزتے ہوئے کہا اے جبروت والے بادشاہ! تو خوب جانتا ہے کہ تیری چھوٹی بڑی کائنات کے قدموں سے پامال ہونے والی میں ایک عاجز و کمترین مخلوق ہوں۔ بھلا میرے اندر کہاں اتنا حوصلہ کہ تیری پر جلال امانت کا بار اٹھا سکوں۔'' (55)

ارشد القادری کے کہانی کا اسلوب تحریر بے باک اور سچا بیانیہ ہے۔ جو قاری کو مسحور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کے دریچوں کو جھنجھوڑتا ہے زبان کو عام فہم اور روز مرہ سے قریب رکھنے کے لیے جملے بہت چھوٹے چھوٹے لکھے ہیں۔ جو دیکھنے میں الگ الگ معلوم ہوتے ہیں مگر روانی سے پڑھتے ہوئے یہ سب مربوط ہو جاتے ہیں اور ایک مکمل معنی دینے کے علاوہ بھرپور تاثر پیدا کرتے ہیں:

اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''دیکھو یہ دنیا اپنے آخری مرحلے سے گزر رہی ہے عنقریب یہ اسی نقطہ پر پہنچنے والی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی تھی میں بھی وہیں جا رہا ہوں لیکن مجھ سے پہلے انسانوں کے لاکھوں کارواں وہاں پہنچ چکے ہیں۔ آہ! اب کس منھ سے ہم آسمانی دربار کا رخ کریں گے۔ جو لوگ ہم سے پہلے جا چکے ہیں وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے مگر انھیں کیا خبر کہ درمیان راہ میں ہماری متاعِ حیات لٹ گئی؟۔'' (56)

مختصر یہ کہ کہانی دربار کا ہیرا۔ ایک خواب ایک حقیقت بہترین کہانی ہے جس میں ارشد القادری نے اسلوب کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

دو یتیموں کا خون

کہانی دو یتیموں کا خون میں ارشد القادری نے دو یتیم بچوں کی معصوم زندگی کی درد بھری کہانی کو موضوع بنایا ہے۔ کہانی کا سلسلہ شہدائے کربلا سے ہے۔ دونوں یتیم بچے امام مسلم کے لاڈلے ہیں، جن میں سے ایک کا نام محمد تھا اور ان کی عمر آٹھ برس تھی اور دوسرے کا نام ابراہیم تھا اور ان کی عمر چھ سال کی تھی۔ شہدائے کربلا کے خاندان کے یہ دونوں بچے کسی طرح بچ گیے تھے۔ جب ابن زیاد نے حکومت کے سپاہیوں کو ان کی تلاش کا حکم دیا تو یہ جنگل جنگل رات دن تلاش کرتے پھرتے ہیں ایک سپاہی دھوکے سے ان دونوں کو کسی جانثار اہل بیت کے گھر سے ڈھونڈ نکالا اور دونوں کو قتل کر ڈالا۔ اسی واقعے کو ارشد القادری نے بڑے دردناک اور دلدوز صورت میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے دردناک واقعے کو بیان کرنے کے لیے بے حد مناسب الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور اپنی نثر کو منتخب اور خوبصورت الفاظ سے سجا کر ایسا اسلوب پیدا کر دیا ہے جو سادہ ہے مگر اپنے اندر کشش اور دلچسپی کے عناصر سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

''تلواروں کی دھار، برچھیوں کی انی اور نیزوں کی نوک پر اب بھی خون کے نشانات موجود تھے۔ ابن زیاد کے حکم سے حضرت امام کی مقدس نعش شاہراہ عام پر لٹکا دی گئی تھی۔ کئی دن تک لٹکی رہی بنی کا کلمہ پڑھنے والے کھلی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر دیکھتے رہے۔ آل رسول کی جان لے کر بھی شقاوتوں کی پیاس نہیں بجھتی، ہائے رے نیرنگئ عالم! زمین و آسمان کی وسیع کائنات جس کے گھر کی ملکیت تھی آج اسی کی تربت کے لیے کوفے میں گز بھر زمین نہیں مل رہی تھی۔'' (57)

اپنے تمام کہانیوں کی طرح اس کہانی میں مذہبی اثر پیدا کرنے کے لیے مخصوص الفاظ کا برمحل استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے اور اثر انگیزی میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ اسلوب بیان میں ایک خوبصورت ربط و تسلسل برقرار ہے۔ اس میں واقعات و کردار اور زبان و بیان کے درمیان وہ خوبصورت اور متوازن تال میل موجود ہے جو کہانی کو ہر قسم کے جھول سے پاک رکھتا ہے اور قاری کے دلچسپی کو بنائے رکھتا ہے۔ گمشدہ مقامات، رشتوں کی یاد ایک کسک کے روپ میں ملاحظہ کیجیے:

''رات کا وقت دہشت انگیز سناٹا، بھیانک اندھیرا خوف و ہیبت میں دوبا ہوا ماحول اور آغوش مادر کی تازہ بچھڑی ہوئی دو ننھی جانیں نہ ہاتھ میں عقل و شعور کا چراغ نہ ساتھ میں کوئی رفیق و رہبر، تھوڑی دور چل کر راستہ بھول گیے۔ ہائے رے گردش ایام! کل تک جن لاڈلوں کا قدم پھولوں کی سیج پر تھا آج ان ہی کی راہوں میں کانٹوں کی برچھیاں کھڑیں تھیں جو اپنے ناناجان کے مزار تک بھی باپ کی

انگلیوں کا سہارا لئے بغیر نہیں جا سکتے تھے آج وہ یکہ و تنہا دشت غربت میں بھٹکتے پھر رہے تھے کبھی عادت نہیں تھی چلتے چلتے گر پڑتے قدم قدم پر ٹھوکر لگتی تلووں میں کانٹے چبھتے تو اُف کر کے بیٹھ جاتے ہوا سنسناتی تو دہشت سے کانپنے لگے پتے کھڑکتے تو ننھا سا کلیجہ سہم جاتا۔ درندوں کی آواز آتی تو چونک کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ڈر لگتا تو ٹھٹھک جاتے، پھر چلنے لگتے کبھی بلک بلک کر ماں کو یاد کرتے کبھی مچل مچل کر باپ کو آواز دیتے کبھی حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منھ تکتے، اور کبھی ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے۔'' (58)

کہانی کو اختتام تک پہنچانے کے آخری مرحلے میں جس منظر کو پیش کیا گیا ہے اس سے کہانی کی اثر انگیزی دوبالا ہوگئی ہے۔ ارشد القادری نے یہاں اپنی اسلوب بیانی کی مہارت کا نمونہ پیش کیا ہے دو بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو درد انگیز بنانے اور اسی کو پوری کہانی کا مرکز بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس سے پوری کہانی کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور قاری اس کی سحر انگیزی میں محو ہو جاتا ہے۔ زبان و بیان کا انداز اور طرز اسلوب کا نمونہ ان اقتباس سے سمجھا جا سکتا ہے:

''خدا کے لیے اب بھی مان جا۔ آل رسول کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین مت کر۔ رحم و غم گساری کے جذبے میں ذرا ایک بار آنکھ اٹھا کر دیکھ! بچوں کی ننھی جان سوکھی جا رہی ہے۔ تلوار سامنے سے ہٹا لے ظالم۔ نفس کا شیطان پوری طرح مسلط ہو چکا تھا ساری منت و سماجت بے کار چلی گئی غصے میں بھر پور تلوار کا وار بیوی پر چلایا وہ پیکر ایمان گھائل ہو کر تڑپنے لگی بچے یہ دردناک منظر دیکھ کر سہم گیے۔ اب سیہ بخت جلاد اپنی خون آلود تلوار لے کر بچوں کی طرف بڑھا چھوٹے پر وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ بڑا بھائی چیخ پڑا۔ خدا را پہلے مجھے ذبح کر۔ جان سے زیادہ عزیز بھائی کی تڑپتی لاش میں نہیں دیکھ سکوں گا۔ چھوٹے بھائی نے سر جھکاتے ہوئے خوشامد کی۔ بڑے بھائی کے قتل کا منظر مجھ سے ہرگز نہ دیکھا جائے گا۔ خدا کے لیے پہلے میرا سر قلم کر۔'' (59)

تاراج کارواں

تاراج کارواں ارشد القادری کی کہانیوں کا مجموعہ ''لالہ زار'' کی آخری کہانی ہے جس میں انھوں نے واقعات کربلا کو موضوع بنایا ہے انھوں نے واقعات کربلا کو شروع سے آخر تک کے ہر جزئیات کو باریکی سے بیان کرنے کے بجائے امام حسین کی شہادت کے بعد خاندان رسالت کے لٹے پٹے قافلے کی تاراجی کو اہمیت دی ہے پھر بھی کہانی کو پڑھتے وقت کربلا کا پورا واقعہ ہمارے آنکھ کے سامنے آجاتا ہے انھوں نے منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے اس میں رمزیت سے معمور سادہ شستہ اور رواں اسلوب سے مزین بہت سے مناظر ملتے ہیں جن میں انھوں نے اظہار بیان کے تجربے بھی کیے ہیں۔ منتخب الفاظ اور لب ولہجہ کو جس تخلیقی حسن سے انھوں نے اپنی نثر میں سمویا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اپنے مزاج کے اعتبار سے ارشد القادری کا اسلوب شاعری کے انداز سے معمور ہے۔ دیکھیے ایک اقتباس:

''زخموں سے چور خون میں شرابور، سیدہ کا راج دلارا جیسے ہی زمین پر گرا کائنات کا سینہ دہل گیا۔ کعبے کی دیواریں ہل گئی، چشم فلک نے خون برسایا، خورشید نے شرم سے منھ ڈھانپ لیا اور گیتی کی ساری فضا ماتم واندوہ سے بھر گئی۔ اب بنو ہاشم کے یتیم کہاں جائیں؟ کس کا منھ تکیں؟ کاشانۂ نبوت کی وہ شہزادیاں جن کی عفت سرا میں روح الامین بھی بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں، نسیم صبا بھی جن کے آنچلوں کے قریب پہنچ کر ادب کے سانچے میں ڈھل جائے۔ آج کربلا کے میدان میں کون ان کا محرم ہے جس سے اپنے دکھ درد کی بات کہہ سکیں۔'' (60)

ارشد القادری کی کہانیوں میں نثری اسلوب اور شاعرانہ اسلوب کا جو حسین امتزاج ملتا ہے وہ اس کہانی میں پُرزور طریقے سے ابھر کر سامنے آیا ہے اسلوب کی دلکشی اور زبان کی شگفتگی سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ نثری اسلوب اور شاعرانہ اسلوب کی آمیزش سے انھوں نے اپنے اسلوب بیان کو زیادہ شگفتہ بنانے کی شعوری کوشش کی ہے، جو بیک وقت قاری کو کئی طرح کے لطف سے ہمکنار کراتا ہے۔ امام حسین کے قتل کا منظر، بیواؤں اور سوگواروں کی آہ وفغاں، اہل بیت کا لوٹا پٹا قافلہ اور اس وقت کا قیامت خیز منظر ضبط تحریر سے باہر ہے۔ ہر واقعات کا بیان جس پر اثر انداز سے ان کے قلم کے زد میں آیا ہے قاری کے اوپر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

ایک اقتباس دیکھتے چلیں:

''نانا جان اٹھیے! اب قیامت کا کوئی اور دن نہیں آئے گا آپ کا سارا کنبہ لٹ گیا آپ کے لاڈلے شہید ہو گیے آپ کے بعد آپ کی امت نے ہمارا سہاگ چھین لیا۔ بے آب و دانہ آپ کے بچوں کو تڑپا تڑپا کر مارا۔ آپ کا لاڈلا حسین آپ کے نام کی دہائی دیتا ہوا دنیا سے چل بسا کربلا کے

میدان میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ہماری نگاہوں کے سامنے ذبح کیے گئے آپ کے پیار کا سینچا ہوا چمن تاراج ہو گیا نانا جان ! نانا جان یہ کٹا ہوا سر لیجیے آپ کے انتظار میں اس کی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی ہیں ذرا مرقد سے نکل کر اپنی آشفتہ نصیب بیٹوں کا دردناک حال دیکھیے۔

اپنے امام کا کٹا ہوا سر لیے اہل بیت کا یہ تاراج قافلہ جس دم روضۂ رسول پر حاضر ہوا۔ ہوائیں رک گئیں، گردش وقت ٹھہر گئی بہتے ہوئے دھارے تھم گیے، آسمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ پوری کائنات دم بخود رہ گئی کہ کہیں آج ہی قیامت نہ آجائے۔''(61)

ارشد القادری کے اسلوب بیان کا سادہ مگر دلنشیں انداز کہانی کے آخری حصے میں دلکش انداز میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ کہانی پڑھ کر قاری پر ایک واحد تاثر قائم ہوتا ہے۔ کہانی کے عنوان سے ہی ذہن میں واقعہ کا وہ منظر ابھر کر سامنے آتا ہے جسے مصنف آخری حصے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں انھوں نے قاری کے اوپر وہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو خود اس کے اوپر واقعہ کے گذرنے سے پیدا ہوتا اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں، واقعہ کے اثر انگیزی کو قاری کے ذہن پر مرتب کرنے کا انداز بیان دیکھیے:

''مدینے کی مسافت گھٹتے گھٹتے اب چند منزل رہ گئی ہے ابھی سے پہاڑوں کا جگر کانپ رہا ہے۔ زمین کی چھاتی دہل رہی ہے قیامت کو پسینہ آرہا ہے کہ کربلا کے فریادی مالک کونین کے پاس جا رہے ہیں۔ قافلے میں حسین نہیں ہیں ان کا کٹا ہوا سر چل رہا ہے استغاثے کی ثبوت کے لیے کہیں سے گواہ لانا نہیں ہے بغیر دھڑ کا حسین جب اپنے نانا جان کی تربت پر حاضر کیا جائے گا تو خاکدان گیتی کا انجام دیکھنے کے لیے کس کے ہوش سلامت رہ جائیں گے۔''(62)

زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اوپر کے اقتباس میں وہ ساری فنی خوبیاں سمٹ آئی ہیں جو ایک مختصر کہانی کی وصف ہیں۔ نہ کہانی میں کوئی طوالت ہے اور نہ ہی نثری اسلوب اور شعری اسلوب کے امتزاج نے معیار کو مجروح کیا ہے بلکہ اس سے کہانی میں حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

حواشی:

1۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔8-7، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔1986

2۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔9-8، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔1986

3۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔10-9، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔1986

4۔رئیس القلم نمبر۔ص۔ 7، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

5۔رئیس القلم نمبر۔ص۔225، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

6۔رئیس القلم نمبر۔ص۔225، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

7۔نگہت ریحانہ خان۔ اردو مختصر افسانہ۔ص۔32، کلاسیکل پرنٹرز۔ دہلی۔1986

8۔رئیس القلم نمبر۔ص۔ 211، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

9۔گوپی چند نارنگ۔ مرتب۔اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ص۔77-76، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ۔1990

10۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔12-11، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

11۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔14-13، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

12۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔ 17، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

13۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔19-18، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

14۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔20، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

15۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔ 31، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

16۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔36-35، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

17۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔39، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

18۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔ 41-40، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

19۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔57، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

20۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔65، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

21۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔66، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

22۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔28، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

23۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔93، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

24۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔02-101، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

25۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔103، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

26۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔13-112، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

27۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔114، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

28۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔130، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

29۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔36-135، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

30۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔46-145، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

31۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔147، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

32۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔152، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

33۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔153، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

34۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔157، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

35۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔158، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

36۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔163، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

37۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔176، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

38۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔174، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

39۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔184، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

40۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔89-188، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

41۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔214، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

42۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔199، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

43۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔18-217، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

44۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔232، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

45۔ارشد القادری۔لالہ زار۔ص۔260، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

46۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔97-296، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
47۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔307، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
48۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔313، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
49۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔352، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
50۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔332، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
51۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔347، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
52۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔350، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
53۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔358، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
54۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔368، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
55۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔71-370، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
56۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔75-373، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
57۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔384، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
58۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔390، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
59۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔410، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
60۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔14-413، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
61۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔38-437، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002
62۔ارشد القادری۔ لالہ زار۔ص۔425، مکتبہ جام نور۔ دہلی۔2002

اختتاميه

اختتامیہ

ارشد القادری کے اسلوب کے جائزے کے بعد مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ ان کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ ان کے یہاں روز مرہ کا برمحل اور مناسب استعمال ملتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود آپ کی تخلیقات علم و عرفان کی عظیم دنیا اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کی تحریر کو دیکھنے کے بعد اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ الفاظ و معنی کے بادشاہ تھے۔ انھیں زبان و بیان پر زبردست ملکہ حاصل تھا۔ فارسی و عربی میں مہارت تامہ کے ساتھ ہی وہ مقامی زبانوں کا بھی نہایت لطیف ذوق رکھتے تھے۔

ارشد القادری کی نثر میں وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو کسی زبان کو شاہکار کے درجہ تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہ فنی خوبیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ منتشر خیالات کو موتی کی مانند پرو کر مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعے سجاتے تھے۔ ان کے بیان میں دردو گداز کی فراوانی تھی۔ اسی لیے آپ کی تحریروں میں تسلسل و روانی کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں اور شوکت و عظمت کا پھریرہ لہرا رہا ہے۔

ارشد القادری نے کسی کا رنگ قبول نہ کرتے ہوئے خود اپنا ایک اسلوب وضع کیا، اور زبان و بیان کی اعلیٰ خوبیوں کی بنا پر وہ اپنے تمام معاصرین پر غالب رہے۔ ان کی زبان کی شستگی، شگفتگی اور سلاست و روانی نے آپ کو اپنے معاصرین پر فوقیت دے دی ہے۔ یہ آپ کا اسلوب نگارش ہی تو ہے جس کی وجہ سے آپ کی تحریریں حیات جاودانی حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کا خلوص، جذبہ صادق، والہانہ عشق، عقیدت، تبحر علمی، روحانی بلندی، زبان دانی اور فصاحت و بلاغت اور تخیل و تفکر نیز انداز بیان یہ سبھی ان کے اسلوب کے عناصر ترکیبیں ہیں۔ ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی ارشد القادری کے اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں ''میں نے ان کو پڑھا ہے، ان کی کتابیں پڑھی ہیں، مناظرہ اور سفر کی سرگذشتیں پڑھی ہیں۔ ان کا جو اسلوب تھا، اس کے بانی وہ خود ہی تھے۔ اس اسلوب نے اس دور کے تمام اسالیب کو مات دے دیا، سب کا دل جیت لیا۔ اپنے تو اپنے بے گانے بھی آہ اور کراہ پر مجبور ہو کر رہ گیے، طرفہ یہ ہے کہ ان کو

بھی حالت اطمینان نصیب نہ ہوئی، جو کچھ لکھا برجستہ لکھا، قلم برداشتہ لکھا، سفر میں لکھا، ٹرین اور پلین میں لکھا، یہاں تک کہ جیل میں بھی لکھا، جہاں بھی لکھا۔ کتابوں کی مدد سے کم، قوت حافظہ کی مدد سے زیادہ لکھا جو کچھ لکھا، قوت متخیلہ نے اس پر ایسی دل کشی، ایسی چاشنی کا غازہ مل دیا، قارئین نے کچھ مسرور ہو کر پڑھا، بار بار پڑھا، مزے لے لے کر پڑھا اور کچھ مجبور ہو کر پڑھا۔

نئی لفظیات، نئی ترکیب، نئی بندش، نیا استعارہ، نئی تشبیہہ، نئی تعبیر سب کچھ جدید، اسلوب جدید، لہجہ جدید، پیرایہ جدید، پیشکش جدید، ایسی جدت، ایسا نیاپن کہ ان کو ہر طبقہ نے پڑھا، اپنے ہم عصروں میں جتنا وہ پڑھے گئے کسی کو یہ رتبہ نصیب نہیں ہوا۔'' (1) ماہنامہ جام نور۔ص۔17-16، جولائی۔2008

ہر موضوع مواد، مضمون، نوعیت اور تکنیک کے اعتبار سے جداگانہ اسلوب اور پیرایۂ بیان کا متقاضی ہوتا ہے۔ ارشد القادری نے اپنی تصنیفات میں ادب کے جملہ تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن اس حسن ادا کے ساتھ کہ دلکشی، لطافت اور رعنائی جو ان کی تحریروں کا قدر مشترک ہے ہر تصنیف میں نمایاں رہے اور یہی خصوصیات ان کی تحریروں کو دیگر تمام تحریروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ اس لیے موضوع چاہے جو بھی ہو ان کی دو چار سطروں اور جملوں کو پڑھنے کے بعد قاری بہ آسانی ان تک پہنچ جاتا ہے۔

ارشد القادری نے مسلمانوں کے اندر اسلامی فکر بیدار کرنے کے لیے اپنی قلمی صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کیا، آپ نے مسلم قوم کے سلگتے ہوئے مسائل کو ہی اپنا موضوع سخن بنایا۔ مردہ قلوب و اذہان میں اسلام کی حقیقی اسپرٹ بیدار کرنے میں تاحیات محنت و مشقت کے ساتھ مصروف کار رہے۔

ہندوستان میں فکری انقلاب پیدا کرنے والوں کی فہرست میں ارشد القادری کا نام بہت نمایاں ہے۔ آپ نے ذہنوں کی تطہیر اور ان کی تربیت و تہذیب میں اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کا خوبصورت مظاہرہ کیا۔ آپ کی گراں قدر تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے قلم کو فکر اسلامی کی اشاعت میں ہی ہمیشہ مصروف رکھا۔ ارشد القادری نے عصری ادب میں اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا ہوتا تو یقین جانیے کہ ان کا شمار بھی عصری ادب کے سرفہرست ناقدین میں ہوتا۔ وقت کا المیہ ہے کہ زمرہ بندی و گروہ بندی کی خطرناک مہم نے مذہبی ادب کو سرمایۂ ادب اردو سے الگ کر دیا جس سے اردو زبان و ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ قدرت نے موصوف کو عمدہ ادبی نثر نگاری کی وہ صلاحیت بخشی تھی کہ وہ چاہتے تو اردو ادب کو کئی

افسانوی مجموعے اور ضخیم ناولوں کی مجلدات دے سکتے تھے مگر انھوں نے دنیا کمانے کے بجائے آخرت کو ترجیح دی۔

صرف چند صفحات میں ارشد القادری کی نثر نگاری اور انشا پردازی کے جائزہ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ ارشد القادری نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو ادب کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے، جس کا کھلے دل سے اعتراف ہونا چاہیے۔ دینی مسائل و موضوعات پر لکھنا دنیا کے کسی ادب میں کبھی شجر ممنوعہ نہیں رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس تحریر میں ادبی حسن ہو اس بنیاد پر خطبات و تفسیر القرآن، سیرت النبی، الفاروق، ترجمان القرآن و خطبات، تفہیم القرآن و رسائل و مسائل، خطبات، پردہ، شعر العجم، حیات شبلی کے مصنفین کے ادبی حیثیات کو تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر ''زلزلہ''، ''زیر و زبر''، ''لالہ زار'' کے مصنف ارشد القادری نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کو اب تک یہ مقام نہیں دیا گیا۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام تر تعصبات سے اوپر اٹھ کر موصوف کے ادبی کارنامے پر غور و فکر کیا جائے اور تحقیق و تدوین کے راستے ہموار کئے جائیں۔ اس مقالے میں صرف ''لالہ زار'' کے حوالے سے ان کے اسلوب پر بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ان کے ادبی کارنامے پر بھرپور روشنی نہیں پڑتی بلکہ ان کے ادبی شہ پاروں کو دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھنا بھی وقت کا اہم تقاضہ ہے تاکہ ان کے کارناموں کا مکمل احاطہ ہو سکے۔

کتابیات

کتابیات

(1) ارشدالقادری۔زیروزبر۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔1986

(2) ارشدالقادری۔لالہ زار۔مکتبہ جام نور۔دہلی۔1986

(3) امیراللہ خاں شاہین۔اردو اسالیب نثر۔تاریخ وتجزیہ۔جمال پرنٹنگ پریس نئی دہلی۔1977

(4) ابن فرید۔ادب دادطلب۔ادارۂ ادب اسلامی ہند۔دہلی۔2002

(5) اقتدار حسین خان۔اسلوب اور اسلوبیات،(مضمون) رسالہ۔عصری ادب۔دہلی۔1977

(6) امام احمد رضا۔فتاویٰ رضویہ۔رضا اکیڈمی۔ممبئی۔۔۔۔۔۔

(7) امام احمد رضا۔اقامۃ القیامۃ علی طاعنِ القیام بنی تھامۃ۔مطبوعہ حیدرآباد۔پاکستان۔

(8) امام احمد رضا۔تقدیر وتدبیر۔المجمع الاسلامی۔مبارک پور۔اعظم گڑھ۔

(9) خواجہ محمد اکرام الدین۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ،تخلیق کار پبلشرز۔ دریا گنج، نئی دہلی۔1994

(10) خوشتر نورانی۔(مرتب) ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی۔مکتبہ جام نور۔دہلی،2007

(11) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔جہاد فی سبیل اللہ۔مرکزی مکتبہ اسلامی۔دہلی۔1994

(12) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔جبر وقدر۔مرکزی مکتبہ اسلامی۔دہلی۔1994

(13) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔الجہاد فی الاسلام۔مرکزی مکتبہ اسلامی۔دہلی۔1993

(14) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔خطبات۔مرکزی مکتبہ اسلامی۔دہلی۔1994

(15) سید ابوالاعلیٰ مودودی۔پردہ۔مرکزی مکتبہ اسلامی۔دہلی۔1994

(16) سید ابوالحسن ندوی۔کاروان زندگی (حصہ اول) مکتبہ اسلام۔گوئن روڈ۔لکھنؤ۔2001

(17) سید ابوالحسن ندوی۔نقوش اقبال۔مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔1976

(18) سید ابوالحسن ندوی۔سیرت سید احمد شہید۔مکتبہ اسلام۔گوئن روڈ۔لکھنؤ۔2001

(19) سید سلیمان ندوی۔ سیرۃ عائشہؓ ۔دارالمصنفین ۔شبلی اکیڈمی۔اعظم گڑھ۔
(20) سید سلیمان ندوی۔ سیرۃ النبی۔(تالیف)۔دارالمصنفین ۔شبلی اکیڈمی۔اعظم گڑھ۔
(21) سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی ۔دارالمصنفین ۔شبلی اکیڈمی۔اعظم گڑھ۔1985
(22) سید سلیمان ندوی۔ سیرۃ النبی۔(تالیف) جلد پنجم۔دارالمصنفین ۔شبلی اکیڈمی۔اعظم گڑھ۔
(23) شہاب ظفر اعظمی۔ اردو کے انشری اسالیب۔تخلیق کار پبلسر۔لکشمی نگر۔دہلی۔1999
(24) شبلی نعمانی۔ الفاروق۔مکمل حصہ اول دوم۔دارالمصنفین ۔شبلی اکیڈمی۔اعظم گڑھ۔1993
(25) شبلی نعمانی۔ شعرالعجم (جلد چہارم)۔مطبع معارف۔اعظم گڑھ۔1999
(26) شبلی نعمانی۔ سیرت النبی۔جلد اول۔ .....
(27) شاہ معین الدین ندوی۔ حیات سلیمان۔معارف پریس۔اعظم گڑھ۔1971
(28) طارق سعید۔ اسلوب اور اسلوبیات۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔1996
(29) عبدالماجد دریابادی۔مکتوبات سلیمان۔(جلد اول) شاہی پریس،لکھنؤ۔1963
(30) عبدالمغنی۔ ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش۔ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ۔1991
(31) گوپی چند نارنگ۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔1989
(32) گوپی چند نارنگ (مرتب)۔اردو افسانہ روایت اور مسائل۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔2004
(33) محمد نفیس حسن۔ میری تمام سرگزشت۔محمد نسیم حسن۔دریا گنج۔دہلی۔2000
(34) مبارک حسین مصباحی۔ جہان رئیس القلم۔المجمع المصباحی۔مبارک پور۔اعظم گڑھ۔2002
(35) مرزا خلیل احمد بیگ۔ زبان۔اسلوب اور اسلوبیات۔ادارۂ زبان واسلوب۔علی گڑھ۔1983
(36) محی الدین قادری زور۔ اردو نثر کے اسالیب بیان۔حیدرآباد۔1936
(37) نگہت ریحانہ خان۔ اردو مختصر افسانہ۔فنی و تکنیکی مطالعہ۔کلاسیکل پرنٹرز۔دہلی۔1986
(38) وقار عظیم۔ فن افسانہ نگاری۔ایجوکیشنل بک ہاس۔علی گڑھ۔ 1990

خصوصی نمبر—

(1) اعلیٰ حضرت نمبر۔ عالمی سہارا۔ دہلی۔ مارچ۔ 2008

(2) رئیس القلم نمبر۔ مکتبہ جام نور۔ دہلی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔ 2002

(3) کاروان رئیس القلم (سالانہ مجلّہ)۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء۔ ذاکر نگر، نئی دہلی۔ 2007

(4) مفکر اسلام نمبر۔ عالمی سہارا۔ دہلی۔ اپریل۔ 2007

رسائل—

(1) ماہنامہ جام نور ۔مکتبہ جام نور۔ دہلی۔ جون۔ 2006

(2) ماہنامہ جام نور ۔مکتبہ جام نور۔ دہلی۔ جولائی۔ 2006

(3) ماہنامہ جام نور ۔مکتبہ جام نور۔ دہلی۔ ستمبر۔ 2006

(4) ماہنامہ جام نور ۔مکتبہ جام نور۔ دہلی۔ جولائی۔ 2008

(5) معارف۔ جولائی۔ 1950

ARSHADUL QADRI KA USLOOB

(LALA ZAAR KE HAWALE SE)

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University
In partial fulfillment of the requirements
For the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

BY

MD.FIROZ AKHTAR

SUPERVISOR

DR.K.M.EKRAMUDDIN

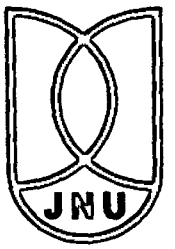

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE AND CULTURE STUDIES
JWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067

2008